نگار

سالانہ چندہ (بحساب ۱۲ نمبر)	قیمت فی کاپی
ہندوستان و پاکستان	ہندوستان (پاکستان)
آٹھ روپیہ ۲۵ پیسے	آٹھ روپیہ بارہ آنہ
۶۹ پیسے	۱۱ر

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔ اس لیے ضخامت بھی زیادہ ہے۔ قیمت چار روپیہ (علاوہ محصول)

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا، ہر افسانہ ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔ قیمت ۸ صرف (علاوہ محصول)

من و یزداں

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک عنبر فشاں کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک رشتے سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے جس میں مذہب کی تخلیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی، اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشا اور پُرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے قیمت سات روپیہ آٹھ آنہ ہے (علاوہ محصول)

مجموعۂ مذہبی استفسارات و جوابات

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس ہارون (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) قارون (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) توبہ (۱۵) لقمان (۱۶) برزخ (۱۷) یاجوج و ماجوج (۱۸) ہاروت و ماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ۔ ضخامت ۲۶۲ صفحات کاغذ سفید و بنیر قیمت پانچ روپے آٹھ آنہ۔

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخی اور انشار لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا، اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشار نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ قیمت دو روپیہ (علاوہ محصول)

ترغیبات جنسی یا شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ مختصر تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی، نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے، نیا اڈیشن۔ قیمت دس روپیہ علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں (۱) چند گمشدہ فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ (۲) مانی کا مذہب نہایت دلچسپ اور مفید کتاب ہے قیمت عہ علاوہ محصول

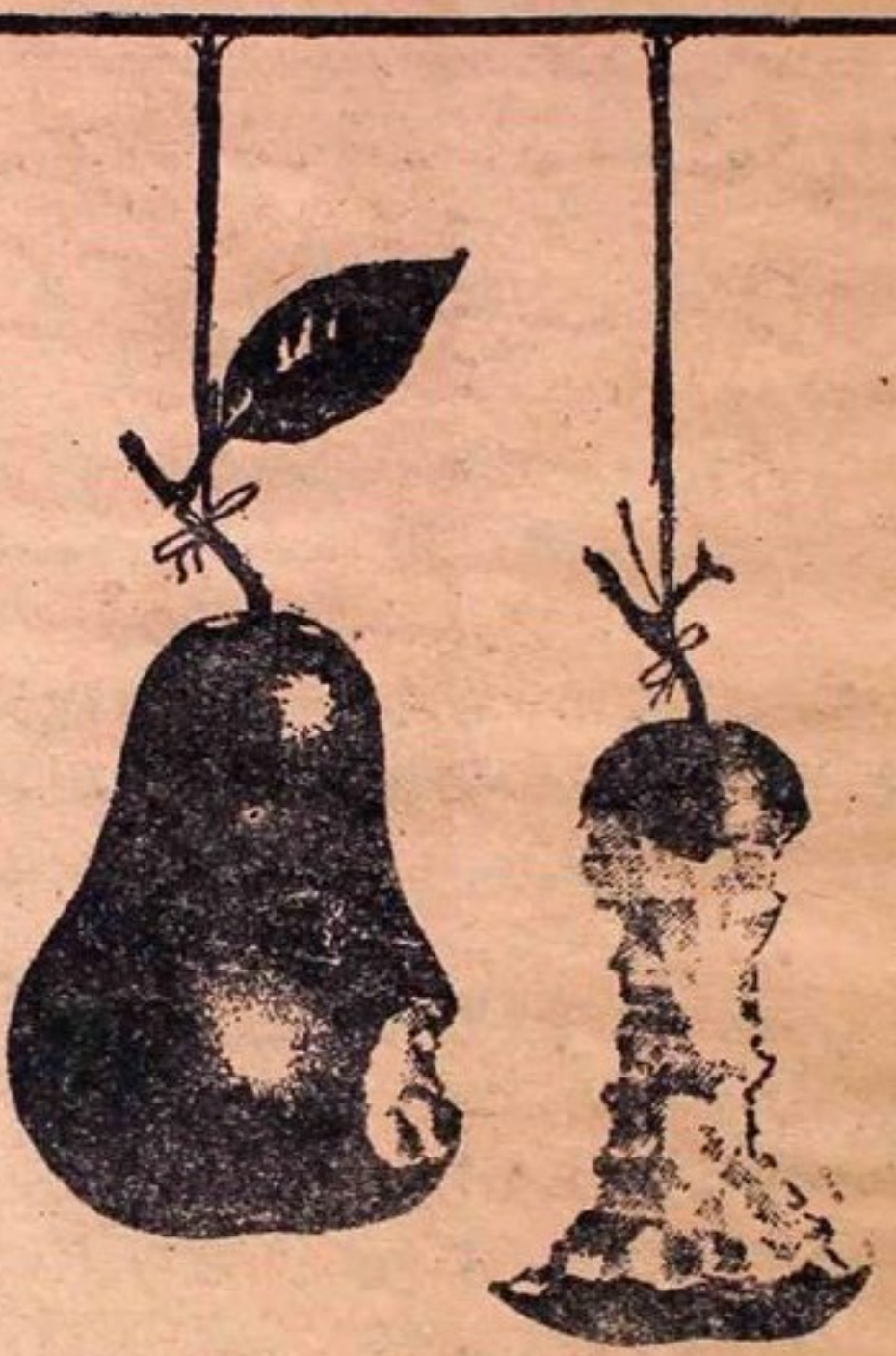

پہچانی صورتیں ... اُن جانی سیرتیں

ناشپاتیوں کے اس جوڑے ہی کو لیجئے۔ بظاہر دلکش رنگت کے باوجود، محض دیکھنے ہی سے آپ یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ یہ باذائقہ ہیں یا بدمزہ! اس لئے جب بھی ناشپاتیاں خریدیئے، پہلے چکھ لیجئے!

لیکن فرض کیجئے آپ کو صابن خریدنا ہے تو کیا کیجئے گا؟ اسے چکھنا تو بہرحال ممکن نہیں! خریدار ایسی چیزیں خریدتے وقت ایک بات دھیان میں رکھتے ہیں۔ یعنی چیزوں کا **نام** اور **چھاپ** جنھیں استعمال کر کے وہ قابلِ اعتبار پا چکے ہیں۔

لگ بھگ ۴۰ برسوں سے لوگ ہندوستان لیور کی مصنوعات پر اُن کی مستقل خوبیوں کے باعث، اعتبار کرتے آرہے ہیں۔ اور یہ اعتبار ہماری جانچ پرکھ کی بدولت ہے۔

ہندوستان لیور میں ہفتہ وار لگ بھگ ۳۰۰ بار مال کو جانچا پرکھا جاتا ہے۔ کچے مال سے لیکر مصنوعات کے تیار ہونے تک قدم قدم پہ اُن کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ اس بات کا خاص طور پہ خیال رکھا جاتا ہے کہ یہ چیزیں بار برداری میں یا پڑی پڑی خراب نہ ہوں۔ تجربہ گاہ میں مختلف درجوں کی آب و ہوا پیدا کر کے ان مصنوعات پر اُن کے اثر کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے۔

اسی لئے ہماری مصنوعات۔ جیسے لائف بوائے صابن، ڈالڈا، ناسپتی، گنجز ایس۔ آر۔ ٹوتھ پیسٹ۔ میں وہ خوبیاں پائی جاتی ہیں جنکے باعث ان کا گھر گھر میں چرچا ہے۔ ان پہ دُور دُور تک اعتبار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ انھیں کڑی جانچ پڑتال اور مشکل آزمائشوں میں سے گذرنا پڑتا ہے۔ پہلے ہمارے ہاں اور اسکے بعد آپکے ہاتھوں!

ہندوستان لیور کا آدرش ۔ گھر گھر کی خدمت

HLL 6-XF2UD

نئی کرنسی اور ڈاک کے نئے ٹکٹ کی وجہ سے

نگار کے سالانہ چندہ میں خفیف سا اضافہ

نئے سکوں اور ڈاک کے نئے ٹکٹوں کا جو اثر رسایل و جرایدپر پڑا ہے اس کا اندازہ یوں ہوسکتا ہے کہ اس سے قبل پیسے پیسے والے ٹکٹ (جو دس تولہ وزن تک اخباروں اور رسالوں میں لگائے جاتے تھے) روپیہ میں ۶۴ ملتے تھے، لیکن اس قیمت کے ٹکٹ اب روپیہ میں صرف ۵۰ ملیں گے اور اس طرح ہم کو سوا دو آنے زیادہ ادا کرنا پڑیں گے۔

اس کمی کو پورا کرنے کا طریقہ صرف یہی ہوسکتا ہے کہ اس نقصان کو ہم آپ سب مل کر پورا کریں اور تمام حسابی اُلجھنوں سے گزرنے کے بعد اس کی صرف ایک ہی صورت سمجھ میں آئی ہے کہ ایک کاپی کی قیمت میں صرف ایک آنہ کا اضافہ کردیا جائے یعنی بجائے ۱۰ر کے ۱۱ر فی کاپی اور سالانہ چندہ ۱۲ کی جگہ ۱۳، اس لئے وی، پی سالانہ آٹھ روپیہ ۸۰ پیسے میں روانہ ہوگا لیکن جو حضرات سالنامہ ذریعہ رجسٹری حاصل کرنا چاہیں گے انھیں ۲۵ پیسے زیادہ ادا کرنا پڑیں گے۔

پاکستان چونکہ پاکستان کا سکہ نہیں بدلا ہے اور وہاں وی، پی نہیں جاسکتا اس لئے وہ اپنا سالانہ چندہ بجائے ذیل کے پتہ پر ہمارے نمایندہ کو خدیہ منی آرڈر روانہ فرمائیں اور رسید ڈاک خانہ براہ راست ہمارے پاس بھیجدیں (جس میں ۸ر مصارف رجسٹری سالنامہ بھی شامل ہیں) اور اگر پاکستانی ایجنٹوں سے ماہ بماہ کاپی خریدنا پسند کرتے ہیں تو ۱۱ر فی کاپی ادا کریں۔

منی آرڈر کا پتہ :- ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۱۰۵ - گارڈن ویسٹ - کراچی۔

سالنامہ محفوظ حاصل کرنے کے لئے ۵۰ پیسے کے ٹکٹ ضرور روانہ فرمائیے

سالنامہ ۱۹۵۸ء
معلومات نمبر ہوگا

سالنامہ محفوظ حاصل کرنے کے لئے ۵۰ پیسے کے ٹکٹ ضرور روانہ فرمائیے

اس سالنامہ کی خصوصیات کا تفصیلی بیان مشکل ہے، کیونکہ یہ بڑا نادر مجموعہ ہوگا، ایسے سیکڑوں علمی، تاریخی، ادبی و تنقیدی مباحث کا جو اڈیٹر نگار کے قلم سے نکل چکے ہیں اور جو یکجا آپ کو کہیں نہیں مل سکتے۔ یہ مجموعہ ایک قسم کی انسائکلوپیڈیا ہوگا جس سے آپ کو بہت سے اُن سوالات کا جواب مل سکے گا جو اکثر آپ کے ذہن میں آتے رہتے ہیں اور جن کے جاننے کا کوئی آسان ذریعہ آپ کے پاس نہیں ہے۔ منیجر نگار

نگار کے بعض سالناموں کی قیمت میں اضافہ

(چند دن کے بعد آپ کو کسی قیمت میں بھی نہیں مل سکتے)

مومن نمبر — تین روپیہ ریاض نمبر — تین روپیہ پاکستان یا جوبلی نمبر — پانچ روپیہ افسانہ نمبر — تین روپیہ مشرقِ وسطیٰ نمبر — پانچ روپیہ حسرت نمبر — تین روپیہ داغ نمبر — چھ روپیہ

فرمانروایان اسلام نمبر — چار روپیہ علوم اسلامی نمبر مع تتمہ — چار روپیہ خدا نمبر — پانچ روپیہ اصناف سخن نمبر — پانچ روپیہ

محصول ڈاک ذمہ خریدار

منیجر نگار لکھنؤ

بعض کمیاب کتابیں

ان کتابوں پر کمیشن نہیں دیا جائے گا۔ قیمتیں علاوہ محصولڈاک ہیں

درۂ نادرہ محمد مہدی خاں ۔۔ ۱۱؍۰ء
تذکرہ دولت شاہ سمرقندی ۔۔۔ ۸؍
تذکرہ گلستانِ مسرت ۔۔ عبدالرحمٰن ۲۳؍۰ء
تذکرہ علمائے ہند ۔۔ رحمان علی ۔۔ ۷؍
تذکرہ شوکت نادری ۔۔۔۔ ۷؍
دبستان المذاہب ۔۔ مرزا محسن ۔ ۱۵؍۰ء
قصاید عرفی مشہدی ۔۔ جمال الدین ۔ ۷؍
دیوان نظیری ۔۔۔۔۔۔۔ ۷؍
دیوان ناصر علی سرہندی ۔۔۔۔ ۶؍
دیوان ہلالی ۔۔۔۔۔۔۔ للعہ؍
حدیقہ حکیم سنائی ۔۔۔۔ ۲۳؍۰ء
دیوان حافظ مشہدی ۔۔۔۔ ۸؍
کلیات غالب اسداللہ خاں ۔ ۱۸؍۰ء
خونابۂ جگر ۔۔ غلام غوث خاں بیخبر ۔۔ ۸؍
دیوان ظہوری ۔۔ نورالدین ۔۔ ۱۵؍۰ء
دیوان صائب ۔ مرزا محمد علی ۔۔ ۷؍
کلیات سعدی شیرازی ۔۔۔ ۱۵؍۰ء
کلیات جلال اسیر ۔۔۔۔ ۱۵؍۰ء
دیوان واعظ ۔۔ ملا رفیع واعظ کاشفی ۴۵؍للعہ
دیوان کلیم ۔۔۔ ابوطالب کلیم ۔۔ ۲۵؍للعہ
دیوان شوکت ۔۔۔۔۔ ۴۵؍۰ء
دیوان فطرت ۔۔۔۔۔۔ ۱۵؍۰ء
دیوان میلی ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۵؍۰ء
دیوان ذوق ۔۔ شیخ ابراہیم ۔۔۔ ۲؍
رسایل شبلی ۔۔۔۔۔۔۔ ۵؍

ہفت پیکر ۔۔ مولانا نظامی ۔۔۔ ۷؍
ہشت بہشت ۔۔ ۔۔۔۔۔۔ ۷؍
مثنوی قران السعدین ۔ امیر خسرو ۔۔ ۵؍
ہفت قلزم کامل ۔۔ قبول احمد ۔ ۵۰؍
غیاث اللغات مع چراغ ہدایت ۔۔ ۱۱؍۰ء
مصطلحات الشعراء وارستہ ۔۔۔ ۵؍
منتخب اللغات ۔۔ عبدالرشید ۔۔ ۱۱؍۰ء
دریائے لطافت ۔۔ انشاء اللہ خاں ۔ ۸؍
فرہنگ جہانگیری ۲ حصے کامل ۔۔ ۳۸؍۰ء
بہادر شاہ ظفر ۔ امیر احمد علوی ۔۔ ۵؍
مشاہیر اسلام ۲ جلد ۔۔۔ ۱۵؍۰ء
سیرۃ النعمان ۔۔ شبلی نعمانی ۔۔۔ ۵؍
حیات خسرو ۔۔ ۔۔ ۱۲؍۰ء
سوانح مولانا روم ۔۔ ۔۔ ۸؍
حیات سعدی ۔۔ الطاف حسین حالی ۔ ۵؍
تذکرۂ ہندو شعراء ۔ عبدالرؤف عشرت ۔۔ ۷؍
تذکرہ آبِ بقا ۔۔ ۔۔ للعہ؍
تذکرۂ آبِ حیات ۔ محمد حسین آزاد ۔۔ ۹؍لعہ
تذکرۂ شمیم سخن تذکرۂ شاعرات ۔۔۔ ۷؍
تذکرۃ الخواتین ۔۔۔۔۔۔ ۷؍
حور مقصورات ۔۔ افتخار عالم ۔۔۔ ۷؍
گلکدہ ۔۔ محمد ہادی عزیز ۔۔۔ ۷؍
دیوان ناسخ ۲ حصے ۔ امام بخش ناسخ ۔ ۱۵؍۰ء
موازنۂ انیس و دبیر ۔۔ شبلی ۔۔۔ ۸؍
دیوانِ درد ۔۔ میر درد ۔۔۔ ۶؍

آیات وجدانی ۔۔ مرزا یگانہ ۔۔ ۸؍
مرقع چغتائی ۔ دیوان غالب مصور ۔ ۹۰؍لعہ
باقیات فانی ۔۔۔۔۔۔ للعہ؍
آفتاب داغ ۔۔ نواب مرزا ۔۔ ۷؍
گلزار داغ ۔۔ ۔۔ ۱۱؍۰ء
انتخاب داغ ۔۔ ۔۔ ۷؍
دیوان ولی مع دیباچہ حیدر ابراہیم ۔ ۷؍
تاج سخن ۔ جلیل مانکپوری ۔۔۔ ۸؍
دیوان ذوق ۔ محمد حسین آزاد ۔۔ ۸؍
مقدمہ شعر و شاعری و دیوان حالی ۔ ۸؍
مرأت الغیب ۔۔ امیر احمد مینائی ۔ ۸؍
دیوان قلق ۔ ارشد علی خاں ۔ ۵؍
دیوان شہیدی ۔ کرامت علی ۔۔۔ ۶؍
صنمخانۂ عشق ۔۔ امیر مینائی ۔۔ ۸؍
دیوان امیر اللہ تسلیم ۔۔۔۔ ۵؍
دیوان مجروح ۔۔ میر مہدی ۔۔۔ ۵؍
غنچۂ آرزو ۔ میر وزیر علی صبا ۔۔ ۱۵؍۰ء
مثنوی میر حسن ۔۔ میر حسن ۔۔۔ ۱۰؍
مثنوی گلزار نسیم ۔۔ دیا شنکر ۔۔۔ ۱۰؍
مثنوی ترانۂ شوق ۔۔ احمد علی ۔۔ ۴؍للعہ
منتخب النفایس ۔۔ محبوب علی ۔۔ ۵؍
لغات کشوری ۔۔۔۔۔۔ ۱۲؍۰ء
عود ہندی اسداللہ خاں ۔ ۳؍
مجموعۂ قصاید ذوق مع ترجمہ ۔۔ ۴؍للعہ
مکاتیب امیر مینائی ۔۔ احسن اللہ خاں ۔ ۹؍لعہ

پاکستان میں یہ کتابیں صرف اس صورت میں پہونچ سکتی ہیں کہ پوری قیمت مع محصولڈاک ذریعہ بنک ڈرافٹ پہلے یہاں وصول ہو جائے۔

منیجر نگار لکھنؤ

یاد رکھئے کہ سالنامہ ۵۸ء اسی وقت محفوظ پہونچ سکتا ہے جب آپ ۸/ کے ٹکٹ رجسٹری کیلئے بھیجدیں

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ نومبر میں ختم ہوگیا اور دسمبر کا پرچہ وی پی روانہ ہوگا

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۶۷	فہرست مضامین نومبر ۱۹۵۷ء	شمارہ ۵

ملاحظات - - - - - - - - - - - - - - - - ۴
فلاسفہ کا تصورِ الٰہ - - - (نواب) محمد عباس طالب صفوی - ۶
ہندی کا ایک جلیل القدر مسلمان شاعر - - - مقیت الحسن - - - ۱۶
مصحفی اور داغ - - - افسر امروہوی - - - - - ۱۹
۱۸۵۷ء اور اردو شعراء - - - گوپی چند نارنگ - - - ۳۲
یادِ رفتگاں - - - ریاض مرحوم - - - - - ۴۲
اسلام و شریعت - - - - - - - - - - - - - ۵۰
منظومات :- فضا ابن فیضی - رضا قریشی گوالیاری
نیاز فتحپوری - شفقت کاظمی
غنی احمد غنی - پیغام تابانی ۵۳

ملاحظات

مغربی ایشیا میں امریکہ کی ریشہ دوانیاں

مشرق وسطیٰ، یا مغربی ایشیا اس وقت ساری دنیا کا آماجگاہِ نظر بنا ہوا ہے اور شام و ترکی کی کشیدگی نے اتنی نازک صورت اختیار کرلی ہے کہ اگر ترکی نے دانشمندی سے کام نہ لے کر کوئی معمولی سا جارحانہ اقدام بھی کیا تو آتشِ جنگ کا مشتعل ہوجانا بعید نہیں۔

اس سلسلہ میں قدرتاً یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ شام و ترکی کے تعلقات کی تلخی کا سبب کیا ہے اور ترکی کیوں شام کی سرحد پر اپنی فوجیں جمع کر رہا ہے، لیکن یہ ایسی بات ہے کہ اگر خود ترکی سے یہ سوال کیا جائے تو وہ بھی اس کا کوئی معقول جواب نہ دے سکے گا۔

مشرقِ وسطیٰ کا موجودہ سیاسی موقف سمجھنے کے لئے کچھ زمانہ پیچھے ہٹ کر اس کے پس منظر پر غور کیجئے تو بہ آسانی معلوم ہوسکے گا کہ یہاں کے اضطراب و اختلاف کا سررشتہ کس کے ہاتھ میں ہے اور ترکی کو کیوں شام کی مخالفت پر آمادہ کیا جا رہا ہے۔

دنیا کو معلوم ہے کہ نہرِ سویز کی نزاع میں فرانس و برطانیہ کی ناکامی کا سبب صرف یہ تھا کہ امریکہ نے ان کا ساتھ نہیں دیا، لیکن امریکہ کی یہ پالیسی مصر کے ساتھ کسی ہمدردی کی بناء پر نہ تھی، بلکہ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ اس طرح سرزمینِ عرب پر چھا جانے کے لئے عرب ممالک کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتا تھا، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ نہرِ سویز کا قصہ ختم ہوتے ہی اس نے یہ آواز بلند کی کہ یہاں فرانس و برطانیہ کا اقتدار ختم ہوجانے کی وجہ سے اک سیاسی خلا پیدا ہوگیا ہے اور اس کا پُر کرنا اس لئے ضروری ہے کہ مبادا روس کے اثرات یہاں وسیع ہوجائیں اور عربستان اشتراکی ہوجائے اسکے بعد ہی امریکہ نے اس باب میں عرب ممالک سے گفتگو شروع کی اور کہا جاتا ہے کہ سعودی عرب کو ایک حد تک اس نے ہموار بھی کرلیا تھا، لیکن یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر امریکہ پوری طرح مطمئن ہوسکتا۔ کیونکہ سوال صرف ایک سعودی عرب ہی کا نہ تھا بلکہ دوسری عرب حکومتوں کا بھی تھا اور اس غرض کی تکمیل کے لئے اس نے مسٹر ہنڈرسن کو مامور کیا کہ وہ عرب ممالک کا دورہ کرکے انھیں امریکن پلان میں شامل ہونے پر مایل کرے۔

ان ممالک میں ترکی و عراق کی طرف سے تو خیر امریکہ مطمئن تھا، کیونکہ یہ دونوں میثاق بغداد کے رکن تھے اور پہلے ہی سے اس جال میں پھنسے ہوئے تھے، لیکن دوسری ریاستوں کی طرف سے وہ مطمئن نہ تھا خصوصیت کے ساتھ شام کہ سب سے زیادہ خطرہ اسی کی طرف سے تھا اور یہ سارا جال اسی لئے بچھایا گیا تھا کہ کسی طرح شام کو اس میں پھانس لیا جائے۔ ہنڈرسن کے دورہ کا اثر اتنا تو ضرور ہوا کہ لبنان راضی ہو گیا کیونکہ اس کی اقتصادی حالت بہت خراب ہے اور وہ امریکن امداد کو رد نہ کر سکتا تھا، لیکن شرق اردن، سعودی عرب پر یہ جادو پوری طرح نہ چل سکا (مصر تو خیر پہلے ہی سے امریکن پلان کا مخالف تھا)

شرق اردن میں تو اول اول کامیابی کی کچھ صورتیں پیدا ہو چلی تھیں اور شاہ اردن کو یہ یقین دلا کر کہ شام اور مصر اس کی ریاست چھین لینا چاہتے ہیں، اسے شام کا مخالف بنا دیا تھا، لیکن چند دن گزرنے کے بعد شاہ اردن نے محسوس کیا کہ یہ محض امریکی پروپاگنڈا ہے اور بالآخر شام کا حریف بننا اس نے پسند نہ کیا۔

امریکہ کی جب یہ سازش شرق اردن میں ناکام رہی اور سعودی عرب نے بھی صاف صاف کہدیا کہ اگر ترکی نے شام پر حملہ کیا تو وہ اسے برداشت نہ کر سکے گا، تو امریکہ نے ترکی کو سمجھایا کہ شام میں اشتراکی تحریک زور پکڑتی جا رہی ہے اور اگر اس کا فوراً سدباب نہ کیا گیا تو پھر ترکی کی خیر نہیں کیونکہ روس بالکل اس کے سر پر سوار ہو جائے گا اور درۂ دانیال سخت خطرہ میں پڑ جائے گا، ترکی چونکہ پہلے ہی سے امریکہ کا دست نگر ہے اور وہاں سے ہر قسم کی مالی و فوجی امداد حاصل کر رہا ہے اس لئے امریکہ کے اس فریب میں مبتلا ہو گیا اور اس نے شام کو ڈرانے کے لئے اپنی فوجیں سرحد پر جمع کرنا شروع کر دیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ امریکن پلان کو کامیاب بنانے کا یہ طریقہ بالکل غلط ہے جس کو امریکہ اگر آج نہیں تو کل محسوس کرے گا۔

شام اس میں شک نہیں کہ اشتراکی طرز حکومت کی طرف مایل ہے لیکن اس کا یہ رجحان سوویٹ اشتراکیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ وہ اپنے ملک کے حالات کے لحاظ سے ایک عوامی حکومت قایم کرنا چاہتا ہے اور وہ کسی جتھے میں شریک ہونا پسند نہیں کرتا، لیکن اگر ترکی اس کے خلاف کوئی جارحانہ قدم اٹھاتا ہے تو اس کو اپنے تحفظ و بقا کے لئے یقیناً روس سے مدد طلب کرنا پڑے گی اور روس پہلے ہی ترکی کو متنبہ کر چکا ہے کہ اگر اس نے شام کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو اس کی خیر نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ترکی امریکی اسلحہ، امریکی بیڑہ اور امریکی طیاروں کی مدد پر اعتماد کر کے، روس کی اس تنبیہ کو نظر انداز کر دے، لیکن اگر اس نے ایسا کیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس نے ایک عالمی جنگ کو دعوت دیدی ہے اور دنیا کے لئے اس کا نتیجہ جو کچھ بھی ہو، لیکن ترکی اور شام کا تباہ ہو جانا بالکل یقینی ہے — امریکہ کئی سال سے اس تدبیر میں مصروف ہے کہ وہ مغربی ایشیا میں روس کی سرحد کی طرف ایک ایسا گھیرا ڈال دے کہ روس آگے بڑھنے کی جرأت نہ کر سکے، اور شام، عراق و ترکی کے حدود پر فوجی استحکامات قایم کر کے جارحانہ اقدامات کا دروازہ بھی اپنے لئے کھلا رکھے، لیکن ترکی کو چھوڑ کر اس وقت تک کوئی عرب ریاست اس کے لئے آمادہ نہیں ہے، کیونکہ اسرائیل حکومت کے جھگڑے میں جو تلخ تجربہ انھیں ہوا ہے وہ مشکل ہی سے ان کو امریکہ کے مواعید پر اعتماد کرنے کی اجازت دے سکتا ہے۔

حضرت اثر لکھنوی کی غزل اور عروضی بحث

ستمبر کے نگار میں حضرت اثر لکھنوی کی ایک غزل کے بعض مصرعوں پر جناب شعور بریلوی نے چند عروضی اعتراض کئے تھے اور میں نے ان کی تائید کرتے ہوئے حضرت اثر سے درخواست کی تھی کہ وہ اس باب میں قارئین نگار کو مزید استفادہ کا موقع دیں، چنانچہ موصوف نے ازراہِ کرم ایک مضمون اخیر اکتوبر میں ان اعتراضات کی تردید میں روانہ فرمایا، جسے نومبر کے نگار میں شایع ہونا چاہئے تھا، لیکن میں ایسا نہ کر سکا، کیونکہ اس سلسلہ میں مزید تحقیق و جستجو ضروری تھی اور افسوس ہے کہ میں اس کے لئے وقت نہ نکال سکا۔

اب حضرت اثر لکھنوی کا مضمون اور اسی کے ساتھ میرا جواب یا اعتراف جو کچھ بھی ہوگا دسمبر کے نگار میں شایع ہوگا۔

فلاسفہ کا تصورِ الٰہ

(بہ سلسلۂ ماسبق)

(نواب محمد عباس طالب صفوی)

پارمینائڈز

پارمینائڈز ۵۱۴ سنہ ق۔م کے قریب پیدا ہوا۔ اگرچہ وہ ابتداءً فیثاغورثی تھا تاہم اس نے آخر کار فیثاغورث کے فلسفہ سے منحرف ہو کر ایک نئے فلسفہ کی بنیاد ڈالی[1]۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ افلاطون سے لے کر ہیگل تک ہر فلسفی پارمینائڈز کے فلسفہ سے متاثر ہوا[2]۔

زینوفینز کی طرح پارمینائڈز نے بھی اپنے فلسفیانہ خیالات نظم میں بیان کئے ہیں اور مابعد الطبیعیاتی مسایل میں ادب کی چاشنی نے ایک خاص لطف پیدا کر دیا ہے۔

ہیراقلیطس کے برعکس پارمینائڈز نہ تغیر کا قایل تھا نہ اضداد کا اور نہ حرکت کا۔ اُس کا خیال یہ تھا کہ کائنات کا ظاہری تغیر حواس خمسہ کی غلطی کی وجہ سے محسوس ہوتا ہے اور اگر عقل سے کام لیا جائے تو کوئی تغیر محسوس نہیں ہوتا[3]۔

پارمینائڈز نے اپنی فلسفیانہ نظم میں اس استدلال سے کام لیا ہے کہ وجود، وجود سے ظہور میں آیا یا عدم سے۔ اگر عدم سے ظاہر ہوا تو گویا وجود نے خود وجود کو پیدا کیا یعنی بالفاظ دیگر وجود ازلی ہے اور اگر وجود عدم سے ظہور پذیر ہوا تو گویا شے لاشے سے پیدا ہوئی جو محال ہے لہذا یہ ماننا پڑے گا کہ وجود صرف ایک ہے ازلی ہے ابدی ہے اور ہر قسم کے تغیر سے پاک ہے اور چونکہ کائنات کی ہر چیز دراصل وہی ایک وجود ہے، بنابریں یہ ظاہری تغیر اور تضاد مایا ہے سراب ہے فریبِ نظر ہے حقیقتاً نہ وجود کی ابتدا ہے اور نہ زوال - وجود کے ازلی ہونے کی طرح وجود کا ابدی ہونا بھی عقل سے ثابت ہے بایں معنی کہ کسی وجود کے تغیر یا موت کے یا تو یہ معنی ہوں گے کہ وجود وجود میں منتقل ہوا اور یا پھر یہ مطلب ہوگا کہ وجود عدم میں منتقل ہوا۔ پہلی صورت میں یعنی وجود کے وجود میں منتقل ہونے میں دراصل کوئی تغیر ہوا ہی نہیں اور وجود باقی رہا، رہی دوسری شکل تو جس طرح لاشے سے شے کا پیدا ہونا عقلاً ممتنع ہے اسی طرح شے کا لاشے ہو جانا بھی محال ہے[4]۔

ان خوشنما الفاظ کے باوجود یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ پارمینائڈز وجودِ مطلق کو روحانی سمجھتا تھا۔ برٹرنڈرسل نے ہسٹری آف ویسٹرن فلاسفی کے صفحہ ۶۷ پر تصریح کی ہے کہ پارمینائڈز کے نزدیک وجودِ مطلق مادی اور ایک کرہ کی شکل میں تھا ہاں یہ ضرور ہے کہ چونکہ پارمینائڈز اسے ہر جگہ موجود سمجھتا تھا لہذا وہ اسے انقسام پذیر نہیں خیال کرتا تھا۔

امپیڈوکلیز

امپیڈوکلیز ۴۹۵ سنہ ق۔م کے قریب پیدا ہوا اور ساٹھ برس کی عمر میں ۴۳۵ سنہ ق۔م کے قریب مرگیا[5]۔

امپیڈوکلیز نے اپنے پیش روؤں کے متضاد نظریات کی روشنی میں ایک نیا نظریہ قائم کیا مثلاً ہیراقلیطس کا نظریہ تغیر عالم تھا اور

---

[1] A Critical History of Greek Philosophy p. 43

[2] A History of Western Philosophy By Russell p. 67

[3] A History of Philosophy By Webb page 33

[4] History of Philosophy By Weber pages 12-13

[5] "مختصر تاریخ فلسفۂ یونان" صفحہ ۵۶

پارمینائڈز عدم تغیر کا قایل تھا امپیڈوکلیز نے یہ درمیانی راستہ اختیار کیا کہ اشیاء من حیث المجموع پیدا بھی ہوتی ہیں اور فنا بھی لیکن اشیاء کے چار بنیادی جواہر یعنی آتش و آب و باد و خاک نہ کبھی پیدا ہوتے ہیں اور نہ فنا ہوتے ہیں۔ یہ چار جواہر جنھیں متاخرین نے عناصرِ اربعہ کے نام سے یاد کیا ہے امپیڈوکلیز کی نظر میں ذی روح نہیں ہیں لہٰذا ان کی حرکت اور امتزاج کے لئے دو خارجی قوتوں کی ضرورت ہے جنھیں امپیڈوکلیز محبت اور نفرت سے تعبیر کرتا ہے اور روحانی سمجھنے کے بجائے طبیعی اور مادی سمجھتا ہے[1]۔ الٰہیات کے متعلق امپیڈوکلیز کے تصورات میں ابہام بھی ہے اور تضاد بھی یعنی کبھی وہ فیثاغورث کے معتقدات کا قایل نظر آتا ہے کبھی خود اپنے کو ان الفاظ میں خدا کہتا ہے:- "اے دوستو سنو میں اب فانی نہیں ہوں بلکہ غیر فانی دیوتا ہوں اور میں جہاں کہیں جاتا ہوں مرد و زن میری تعظیم کرتے ہیں"۔ اور کبھی اپنی فلسفیانہ نظموں میں اپنے آپ کو دیوتاؤں کا راندۂ درگاہ گناہگار تسلیم کرکے دیوتاؤں کے وجود کا اقرار کرتا ہے[2]۔

(۷) انیکساغورث انیکساغورث ایشیائے کوچک میں ۵۰۰ ق۔م کے قریب پیدا ہوا اور علم و فضل کی تلاش میں وطن چھوڑ کر ایتھنز میں مقیم ہوا۔ انیکساغورث سے قبل ایتھنز میں فلسفہ کا چرچا نہیں تھا اور ایتھنز کو انیکساغورث ہی نے فلسفہ سے متعارف کیا اور پھر رفتہ رفتہ ایتھنز فلسفۂ یونان کا مرکز بن گیا۔ فلسفہ کی تاریخ لکھنے والوں کی اکثریت کا یہ خیال ہے کہ انیکساغورث کو اس جرم میں ایتھنز سے جلا وطن ہونا پڑا کہ وہ سورج اور چاند کو دیوتا نہیں مانتا تھا[3]۔ لیکن مجھے اس رائے سے اس بنا پر اتفاق نہیں ہے کہ جب یونانیوں نے زینوفینز کو دیوتاؤں کے سب و شتم کے جرم کا ارتکاب کرنے کے بعد بھی کسی دینوی عدالت کے سامنے پیش نہیں کیا تو آخر وہ انیکساغورث کو صرف اس خفیف جرم پر کیوں پابندِ زنداں کرتے کہ وہ چاند اور سورج کو دیوتا نہیں مانتا۔ مجھے پروفیسر اسٹیس کی اس تحقیق سے قطعاً اتفاق ہے کہ ایتھنز کے زوالِ قیام میں انیکساغورث سے اور یونانی مدبر پیری کلیز سے کافی مراسم ہو گئے تھے اور چونکہ یونان کی ایک مضبوط سیاسی جماعت پیری کلیز کے خلاف تھی لہٰذا انیکساغورث کو بظاہر الحاد کے جرم میں لیکن دراصل پیری کلیز کی دوستی کی وجہ سے مصائبِ زنداں برداشت کرنا پڑے۔ قید خانے سے فرار بھی اغلباً پیری کلیز کی مدد سے ہوا اور ایتھنز سے فرار کے بعد انیکساغورث پھر اپنے وطن واپس چلا گیا اور وہیں ۷۲ برس کی عمر میں انتقال کیا[4]۔

انیکساغورث کے عہد تک فلاسفہ اصلِ کائنات یا کسی ایک عنصر کو مانتے تھے یا اربعہ عناصر کو اور یا اعداد کو اسی طرح کائنات کا محرک اور مدبر یا خود عناصر کو سمجھا جاتا تھا یا محبت کو یا محبت اور نفرت دونوں کو۔ انیکساغورث نے یہ استدلال پیش کیا کہ آتش و آب و باد و خاک میں سے کسی ایک عنصر کو اصل کائنات سمجھنا اور یہ تصور کرنا کہ ایک جوہر دوسرے جوہر کی شکل میں منتقل ہو سکتا ہے غلط ہے اسی طرح یہ ماننا بھی صحیح نہیں ہے کہ حرکت خود ان عناصرِ اربعہ یا اعداد یا محبت اور نفرت میں مضمر ہے یہ تمام چیزیں بے جان اور غیر ذوی العقول ہیں پھر یہ محرک اور مدبر کیونکر ہو سکتی ہیں؟

انیکساغورث کے نزدیک عناصر چار نہیں بلکہ بے انتہا ہیں۔ اُس کے خیال میں یہ "خورد بینی عناصر" تمام اشیاء کے جراثیم یا اصل ہیں اور ازلی و ابدی ہیں۔ کائنات کی ہر شے انھیں عناصر میں ظہورِ ترتیب کا نتیجہ ہے اور جسے دنیا والے غلط طور سے موت کہتے ہیں وہ انھیں عناصر کے منتشر ہو جانے کا نام ہے۔ ابتدائے کائنات میں بے جان اور جاندار ذوی العقول اور غیر ذوی العقول اشیاء کے عناصر مخلوط تھے صرف ایک جوہر جسے انیکساغورث

---

[1] A Critical History of Greek Philosophy pp. 81-83
[2] A History of Philosophy By Thilly pp. 42-43
[3] A History of Western Philosophy pp. 75-76
[4] A History of Philosophy By Webb page 35
A History of Western Philosophy By Russell p. 8
A Critical History of Greek Philosophy pp. 94-95

دماغ یا عقل کے نام سے یاد کرتا ہے اس بے ترتیب اور مخلوط کائنات سے قطعاً علٰحدہ تھا پھر یہی دماغ اس مخلوط کائنات میں داخل ہوا اور عناصر کو جُدا جُدا کر کے ان کی فطری مناسبت کو مدنظر رکھتے ہوئے متحرک کر کے ملا دیا - یہ دماغ جوہر الجواہر ہے ہر عنصر سے علٰحدہ اور مختلف ہے مرکب نہیں ہے بلکہ مفرد ہے اور کائنات کی حرکت اور زندگی کا منبع ہے - یہ دماغ فاعلِ مختار ہے اور اسے ماضی، حال اور مستقبل کی ہر شے کا علم ہے - اس دماغ نے ہر شے کو کسی خاص مقصد کے لئے بنایا ہے اور یہی کائنات کا حکمراں ہے[1] - نظرِ اول میں انیکساغورث کا یہ دماغ ارسطو کے ماوراء الکائنات خدا کی طرح معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقتاً وہ کسی خدا کا قایل نہیں تھا بلکہ کبھی اس دماغ کو لطیف مادّے سے بھی تعبیر کرتا تھا اور کائنات سے ماوراء سمجھنے کے باوجود نباتات وحیوانات بلکہ جمادات میں بھی شامل سمجھتا تھا - ارسطو نے انیکساغورث پر صحیح اعتراض کیا ہے کہ وہ وجود کے متعلق مادّی علل کا قایل تھا لیکن جب ان علل سے کام نہ چلا تو اس نے بادلِ ناخواستہ دماغ کا مجمل تصور پیش کیا[2] اور ہو سکتا ہے کہ انیکساغورث دراصل نہ موحد ہو نہ ہمہ اوست کا قایل بلکہ برٹرنڈرسل کے قول کے مطابق منکرِ خدا ہو[3] بہرنوع اس حقیقت سے انکار کیا جانا ممکن نہیں کہ انیکساغورث نے ایک ماوراء الکائنات قوت کا تذکرہ کر کے ارسطو کے ماوراء کائنات خدا کے خیال کی ابتدا کی اور دماغ کا تصور پیش کر کے تصوری فلسفہ کی بنا قایم کی جس کو افلاطون نے اپنے زمانہ میں بامِ ترقی پر پہونچایا۔

(۸) لیوپس اور دیماقریطس لیوپس کی تاریخ ولادت و وفات معلوم نہیں لیکن اسے امپیڈوکلیز اور انیکساغورث کا ہم عصر خیال کیا جاتا ہے[4]۔ اُس کی تاریخ ولادت و وفات کی طرح اس کی صحیح تعلیم کا بھی پتہ نہیں ہے بلکہ ابیقورس کو تو لیوپس کے وجود میں بھی شک تھا اور عصرِ حاضر کے بعض مورخین نے بھی لیوپس کے وجود سے انکار کیا ہے، لیکن چونکہ ارسطو نے اپنی تصانیف میں متعدد جگہ لیوپس کا ذکر کیا ہے لہٰذا لیوپس کے وجود کو تو تسلیم کرنا پڑے گا[5]۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ لیوپس کے تصانیف دیماقریطس کی تصانیف میں کچھ اس طرح مدغم ہو گئے ہیں کہ نتواں بجان و جاناں بہم امتیاز کردن کا مصداق بن گئیں خود ارسطو نے جن تصانیف سے لیوپس کے تعلیمات کو اخذ کر کے بیان کیا وہ تحقیق کے بعد دیماقریطس کی تصانیف ثابت ہوئے[6]۔ بنا بریں لیوپس اور دیماقریطس کا ذکر ایک ہی عنوان کے تحت درج کیا جاتا ہے۔

دیماقریطس کا وجود لیوپس کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے یعنی ہمیں معلوم ہے کہ انیکساغورث کی ضعیفی کے زمانے میں دیماقریطس جوان تھا اور مصر کا نہ سہی کم از کم ایران کا سفر اس نے ضرور کیا تھا[7]۔

لیوپس اور دیماقریطس کو نظریۂ سالمات کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے اور ان دونوں کا فلسفہ حقیقتاً اس روحانیت کا ردِّ عمل تھا جو فیثاغورث کے عصر سے فلسفۂ یونان میں شامل ہو گئی تھی اور شاید اسی وجہ سے افلاطون کو دیماقریطس سے اتنی نفرت تھی کہ نہ صرف اس کے ذکر سے اجتناب کیا بلکہ دیوجانس کے قول کے مطابق افلاطون کی یہ تمنا تھی کہ دیماقریطس کے تصانیف نذرِ آتش کر دئے جائیں[8]۔

اب تک یا تو امپیڈوکلیز کے تتبع میں اصل کائنات آتش و آب و خاک و باد کو سمجھا جاتا تھا اور محرک محبت اور نفرت کو اور یا انیکساغورث کی تقلید

---

[1] History of Philosophy By Weber pages 31-33
[2] History of Philosophy By Thilly pages 45-46
[3] History of Western Philosophy page 82.
[4] A critical History of Greek Philosophy page 86
[5] A History of Western Philosophy page 84
[6] "مختصر تاریخ فلسفۂ یونان" صفحہ ۲۱
[7] A History of Western Philosophy page 84
[8] حوالۂ سابق صفحہ ۸۵

میں عناصر بے شمار تصور کئے جاتے تھے اور محرک دماغ کو لیکن اب یہ دلیل پیش کی گئی کہ آتش و آب و خاک و باد یا دوسرے عناصر اس وجہ سے اصل کائنات یعنی جواہر نہیں سمجھے جا سکتے کہ یہ مفرد نہیں ہیں بلکہ غیر مرئی اور لاتجزیٰ ذرات کے مرکب ہیں اسی طرح محبت اور نفرت یا دماغ کو محرک اول ماننے کے بجائے یہ تسلیم کرنا صحیح ہے کہ ان ذرات میں حرکت کی قوت مضمر ہے[1] اور انھیں ذرات کا ایک دوسرے کو ہٹانے کا نام کائنات کی حرکت ہے۔ کائنات کی تکوین میں نہ کسی ارادے کا دخل ہے نہ مقصد کا اور چاند سورج اور سیاروں کی گردش کی باقاعدگی اور حیاتیات میں بظاہر کسی خاص قصد کے آثار کسی دماغ کی پیداوار نہیں بلکہ محض اتفاق کا نتیجہ ہے۔ ارسطو نے دیماقریطس کے نظریۂ حرکت پر اپنے عصر میں یہ اعتراض کیا تھا کہ اس سے رفتار کی توجیہ تو ہوتی ہے مگر خود حرکت کی کوئی توجیہ نہیں ہوتی۔[2]

ظاہر ہے کہ لیوسپس اور دیماقریطس کے مادی نظام میں کسی معبود کی کوئی جگہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود دیماقریطس دیوتاؤں کا قایل تھا اور اس کا خیال تھا کہ :- "کرۂ ہوا کے اندر بعض ہستیاں ایسی بھی ہیں جو انسانی صورت رکھتی ہیں۔ ان کے جسم بہت بڑے اور عمر بہت دراز ہوتی ہے اُن کے اعمال اور ہماری دنیا پر ان اعمال کے اثرات بعض اوقات بھلے ہوتے ہیں اور بعض اوقات بُرے"[3] ہو سکتا ہے کہ دیوتاؤں کے وجود کا اقرار عوام کا توحش دور کرنے کے لئے کیا جاتا ہو۔

(۹) زینو پارمینائڈز کا وفادار اور قابل شاگرد زینو ۴۹۰ ق۔م میں پیدا ہوا اور ۴۳۰ ق۔م میں مرگیا۔[4]

زینو نے اپنے استاد کے نظریات میں کسی نئے نظریہ کا اضافہ تو نہیں کیا لیکن ان کی تائید میں ایسے مدلل براہین پیش کئے کہ ارسطو نے زینو کو منطقی استدلال کا بانی تسلیم کر لیا۔[5]

ہیراقلیطس کے برخلاف پارمینائڈز عدم تغیر کا قایل تھا اور وجودِ واحد کو حرکت و تغیر سے بالاتر سمجھتا تھا لہذا زینو نے بھی کثرت و حرکت کے خلاف دلایل پیش کئے۔

کثرت کے خلاف زینو نے یہ دلیل پیش کی کہ اگر کثرت کا وجود ہے تو وہ بیک وقت بے انتہا چھوٹی اور بے انتہا بڑی ہے یعنی ایک طرف تو کثرت کے یہ معنی ہوں گے کہ اس میں بے شمار عنصری اجزاء شامل ہیں اور یہ عنصری اجزاء ناقابلِ تقسیم ہیں اس لئے کہ اگر وہ قابلِ تقسیم ہوتے تو انھیں عنصری اجزاء نہ کہا جاتا پھر جب وہ عنصری اجزاء ناقابلِ تقسیم ہیں تو ان میں حجم موجود نہیں اس لئے کہ جس شئے میں حجم ہو وہ تقسیم کی جا سکتی ہے بنا بریں اگر وجود میں کثرت ہے تو وہ کثرت ایسے عنصری اجزاء پر مشتمل ہے جن میں کوئی حجم نہیں ہے اور چونکہ کثرت کے عنصری اجزاء میں کوئی حجم نہیں ہے لہذا ان عنصری اجزاء کے مجموعہ (یعنی کثرت) میں بھی کوئی حجم نہیں اور وہ بے انتہا چھوٹی ہے لیکن کثرت بے انتہا بڑی بھی ہے بایں معنی کہ اگر کثرت میں حجم ہے تو وہ قابلِ تقسیم ہے اور چونکہ خود کثرت میں حجم ہے لہذا اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی حجم کا حامل اور قابلِ تقسیم ہوگا اور یہ تقسیم الی غیر النہایہ جاری رہے گی لیکن اگر قلیل سے قلیل حجم کو لا انتہا سے ضرب دیں تو وہ قلیل حجم بھی لامحدود حجم بن جائے گا بنا بریں کثرت بے انتہا بڑی بھی ہے[6]

حرکت کے خلاف زینو کا استدلال یہ ہے کہ اگر حرکت پارمینائڈز کے عقیدے کے مطابق فریبِ نظر کا نام ہے تو اس کی کوئی حقیقت نہیں اور اگر حقیقت ہے تو حرکت کے لئے خلا کا وجود لازمی ہے لیکن اگر خلا حقیقت ہے۔ یعنی اس کا وجود ہے تو اس خلا کا حامل ایک اور خلا ہوگا اور

---

[1] A History of Philosophy By Thilly page 46.
[2] A History of Philosophical Systems Edited by Ferm p. 78
[3] "مختصر تاریخ فلسفۂ یونان" صفحہ ۲۷
[4] A History of Philosophical Systems page 79
[5] "مختصر تاریخ فلسفۂ یونان" صفحہ ۴۹
itical Hist
itical History of Greek Philosophy page 53

اس دوسری خلا کا حامل ایک تیسری خلا کو تسلیم کرنا پڑے گا الیٰ غیر النہایہ یعنی خلا کا وجود ممکن نہیں اور جب خلا کا وجود نہیں تو پھر حرکت کا وجود بھی ممتنع ہے[1]۔

حرکت کے خلاف زینو نے دو اور دلیلیں بھی پیش کی ہیں جو فلسفے کی ہر مشہور کتاب میں درج کی جاتی ہیں اور جن سے سوفسطائیوں کے علاوہ ہر عصر کے متشککین نے بھی کام لیا ہے یعنی اگر دوڑ شروع ہونے کے وقت سست رفتار کچھوا صنمیاتی تیز رفتار اکیلیز سے ذرا بھی آگے ہو تو پھر ابدالآباد تک اکیلیز اس کچھوے کو نہیں پکڑ سکتا کیونکہ جب اکیلیز اس نقطے پر پہونچے گا جہاں کچھوا تھا تو کچھوا اتنی دیر میں کچھ اور آگے سرک چکا ہوگا اور جب اکیلیز دوسرے نقطے پر پہونچے گا تو کچھوا کچھ آگے بڑھ چکا ہوگا الیٰ غیر النہایہ اسی طرح زینو کی دوسری دلیل بھی حرکت کے خلاف ہے یعنی زینو کے نزدیک کمان سے نکلا ہوا تیر بھی متحرک نہیں بلکہ ساکن ہے کیونکہ ہر لمحے میں تیر فضا کے کسی ایک نقطے پر یقیناً ساکن ہے ..... ظاہر ہے کہ برہانیات وجدلیات کا یہ اعوجاج مشاہدے کے بھی خلاف ہے اور عقل عمومی کے بھی خلاف ہے اور عقلِ عمومی کے بھی لیکن پارمینائڈز کی طرح زینو کا بھی نصب العین تھا ہی یہی کہ حواس خمسہ کی شہادت کو مشکوک قرار دے[2] اور زینو کے بعد کے فلاسفہ نے جدلیات کی اس دو دھاری تلوار سے طبیعیات میں بھی کام لیا اور ما بعد الطبیعیات میں بھی۔ خود زینو کے ایک شاگرد گورجیاس نے نہ صرف خلا اور حرکت کے وجود سے انکار کیا بلکہ وجود کے وجود کا بھی منکر ہوگیا۔ گورجیاس کا استدلال یہ ہے کہ اگر وجود کا وجود ہے تو پارمینائڈز کے ثابت کردہ نظریہ کے تحت وجود کا ازلی و ابدی ہونا لازمی ہے لیکن ازلی اور ابدی وجود لامحدود ہوتا ہے اور لامحدود قید زمان و مکان میں محدود ہو جاتا ہے لہذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ کہیں نہیں ہے اور جو کہیں نہیں ہے اُس کا وجود نہیں ہے لہذا وجود کا وجود نہیں ہے[3]۔

زینو کے شاگردوں کا عقیدہ جو بھی ہو لیکن خود زینو اپنے استاد پارمینائڈز کی طرح ایک واحد وجود کا ضرور معتقد تھا۔ ان ایلیاتی فلاسفہ کے عقیدۂ وحدۃ الوجود پر متاخرین معترض ہوئے اور ان اہم اعتراضات کو پروفیسر اسٹیس نے بالاختصار یوں بیان کیا ہے کہ اگر پارمینائڈز اور زینو کے قول کے مطابق وجودِ واحد میں نہ کثرت ہے نہ حرکت نہ عرض تو پھر یہ کثرت کیونکر ظاہر ہوئی حرکت کیونکر پیدا ہوئی اور اشیا میں اعراض یعنی رنگ و بو کے صفات کیونکر وجود میں آئے؟۔ پروفیسر اسٹیس کی نظر میں ایلیاتی فلاسفہ اُس شعبدہ باز کے مماثل ہیں جو لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ اُس نے خالی ٹوپی سے خرگوش وغیرہ نکال کر دکھائے[4]۔

(۱۰) بروطاغورث

بروطاغورث جسے سوفسطائی فلسفے کا بانی سمجھا جاتا ہے ۵۰۰ ق۔م کے قریب دیماقریطس کے وطن ایڈیرا میں پیدا ہوا[5]۔

سوفسٹ یعنی سوفسطائی کے معنی دراصل پروفیسر کے ہیں اور سقراط کے ہم عصر خود سقراط کو سوفسطائی کہتے تھے[6]۔ لیکن افلاطون اور ارسطو کے بُغض کی وجہ سے سوفسطائی کے معنی پروفیسر یا معلّم کے بجائے بے ایمان بحث کرنے والے کے ہو گئے[7] اور ہیگل کے عہد تک سوفسطائیوں کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا گیا[8]۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں ایتھنز سیاسی اور ثقافتی اعتبار سے انتہائی عروج پر تھا۔ (۴۴۹ ۔۔۔ ۵۰۰ ق۔م)

---

[1] History of Philosophy By Weber page 17
[2] A Critical History of Greek Philosophy p. 52
[3] History of Philosophy By Weber page 17
[4] A Critical History of Greek Philosophy page 69
[5] A History of Western Philosophy p. 97
[6] ۔ حوالۂ سابق
[7] A History of Philosophy by Webb p. 22
[8] A History of Philosophy By Thilly page 61

میں ایران سے متعدد محاربات کے بعد ایتھنز یونان کا تجارتی مرکز بن چکا تھا اور مختلف علوم وفنون کے اہلِ کمال کے جمع ہوجانے کی وجہ سے اسے ادبی مرکزیت بھی حاصل ہوچکی تھی۔ اس صدی کے اہلِ کمال تقلید آباء سے گریزاں تھے اور عالمانہ تحقیق کی طرف مایل تھے۔ سوفوکلیز (۴۰۵ - ۴۹۶ ق۔م) اور دوسرے شعراء حیاتِ انسانی اور مذہب کے متعلق نقد وبصر اور غور وخوض میں منہمک تھے۔ مشہور مورخ ہیرو ڈوٹس (سالِ ولادت ۴۸۴ ق۔م) صنمیات کے دفتر بے پایاں میں تاریخی حقایق کی تلاش میں مشغول تھا اور بقراط علم الطب کے سماعیات وتوہمات کو تجربے کی کسوٹی پر کس رہا تھا اور بالواسطہ فلاسفۂ یونان کو دعوت دے رہا تھا کہ عقل کی کسوٹی کے ساتھ محکِ تجربہ کو بھی نظر میں رکھیں۔ فلاسفہ، طبیعیات اور مابعد الطبیعیات میں صرف عقل کو معیارِ حق وباطل سمجھتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ ان میں سے ہر فلسفی کا نظریہ جدا تھا۔ کوئی پانی کو اصل کائنات سمجھتا تھا کوئی ہوا کو کوئی آگ کو کوئی خاک کو اور کوئی ان چاروں کو، کوئی مطلق وجود کا منکر تھا اور محض تغیر کا قایل اور کوئی صرف وجود کا قایل تھا اور تغیر کا منکر۔ یہ تخالف وتکاذب عقل کا کرشمہ تھا۔ بروطاغورث نے متقدمین کے برعکس خود عقل پر نقد وتبصرہ کرنے کی کوشش کی[1] اور اس کوشش میں اس نے خود متقدمین کے عقلی دلایل کو تشکیک کے لئے استعمال کیا مثلاً ہیراقلیطس کی اس عقلی تعلیم سے کہ ہر شے ہر وقت تغیر پذیر ہے اس نے یہ منطقی نتیجہ نکالا کہ چونکہ ہر شے ہر وقت تغیر پذیر ہے لہذا ہر شے کے ادراک کی صحت ہر شخص کے لئے صرف ایک محدود لمحے تک کے لئے ہے اور کسی شے کے ادراک کی صحت کے متعلق کسی ایک شخص کی رائے کو کسی دوسرے شخص کی رائے پر ترجیح دینا ممکن نہیں یعنی حق نفسی اور اضافی ہے خارجی اور کلی نہیں ہے۔ بروطاغورث کے اس نظریہ ارتیاب کی توضیح کے لئے پروفیسر اسٹیس کی کتاب کا ایک اقتباس خالی از افادہ نہیں ہے۔

پروفیسر صاحب کا ارشاد ہے کہ "متقدمین فلاسفۂ یونان ادراک اور فکر مشاہدہ اور تعقل میں امتیاز کرتے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ حق یعنی صداقتِ اشیاء کا احساس حواسِ خمسہ کے ذریعہ سے ممکن نہیں صرف عقل کے ذریعہ سے ممکن ہے۔ ایلیائی فلاسفہ یعنی پارمینائڈز اور زینو بھی یہی کہتے تھے کہ اشیاء وجودِ واحد ہیں اور حواسِ خمسہ کی غلطی کی وجہ سے ہمیں وحدت میں کثرت نظر آتی ہے ہیراقلیطس کا بھی یہی خیال تھا کہ صرف حواسِ خمسہ کی وجہ سے ہمیں کائنات میں عدم تغیر نظر آتا ہے ورنہ عقلاً ہر شے تغیر پذیر ہے اور دیماقریطس کا بھی یہی نظریہ تھا کہ سالمات اتنے چھوٹے ہیں کہ حواسِ خمسہ اُن ذرات کے ادراک سے قاصر ہیں صرف عقل اُن کو سمجھ سکتی ہے۔ بروطاغورث کی تعلیم مشاہدے اور تعقل کے اس امتیاز کو مبہم بنادیتی ہے۔ بروطاغورث کے استدلال کی جان یہ ہے کہ تمام چیزوں کا معیار عقل نہیں بلکہ انسان ہے اور چونکہ ایک ہی شے مختلف انسانوں کو یکساں نہیں دکھائی دیتی بلکہ خود ایک ہی شخص کو (مثلاً صحت اور مرض کی حالت میں) ایک ہی شے کے ذائقہ لامسہ سامعہ اور مشاہدہ میں اختلاف نظر آتا ہے لہٰذا خارج میں کوئی صداقت موجودہ نہیں ہے بلکہ جو شخص جس شے کا جس طرح ادراک کرے وہی صحیح ہے[2] ان دونوں متضاد خیالات میں سے کسی ایک خیال کو بھی غلط نہیں کہا جاسکتا اور ہر قضیے کی موافقت ومخالفت میں دلیل عقلی پیش کی جاسکتی ہے[3] بیسویں صدی کے مشہور فلسفی پروفیسر جوڈ نے بھی بروطاغورث کا ہم نوا بن کر اعتراف کیا ہے کہ جو شخص بھی جدلیات سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ متعدد فلسفیانہ نظریات بدیہی طور سے غلط ہیں مگر ان کو غلط ثابت نہیں کیا جاسکتا[4] اور مابعد الطبیعیاتی مسایل کی موافقت اور مخالفت میں یکساں طور سے قوی عقلی دلایل پیش کئے جاسکتے ہیں[5] بروطاغورث نے اس ارتیاب کے باوجود اس امر کا بھی اعتراف کیا ہے کہ دو متضاد رایوں کا غلط ہونا محال سہی مگر یہ ممکن ہے کہ ایک رائے دوسری رائے سے بہتر ہو مثلاً یرقان کے اُس مریض کی رائے سے جسے ہر شے زرد نظر آتی ہے اس

---

1. A History of Philosophy By Thilly pages 52-57
2. A Critical History of Greek Philosophy pp. 112-116
3. Guide to Philosophy pages 56, 70, 120, 309, 337
4. حوالۂ سابق صفحہ ۱۲۰

تندرست انسان کی رائے بہتر ہے جس کی نگاہ ٹھیک ہے[1] لیکن زینو کا شاگرد گورجیاس اور خود بروطاغورث کے متبعین تشکیکِ محض کے قایل تھے۔

گورجیاس نے تشکیک کے تین نظریات قایم کئے اولاً یہ کہ کوئی شے موجود نہیں ہے ثانیاً یہ کہ اگر بفرضِ محال کوئی شے موجود بھی ہے تو ہمیں اس کا علم حاصل نہیں اور ثالثاً یہ کہ اگر ہمیں اس کا علم حاصل ہے تو ہم اس کا بیان کرنے سے قطعاً قاصر ہیں[2]۔

پہلے نظریہ کی تائید میں اس نے زینو کے جدلیات سے مستفید ہو کر یہ دلیل پیش کی کہ چونکہ نفس وجود میں تضاد موجود ہے لہذا خود نفس وجود کوئی شے نہیں ہے اور پارمینائڈز کے مشہور استدلال کو اس صورت میں پیش کیا کہ اگر کوئی شے موجود ہے یعنی وجود کا وجود ہے تو اس وجود کی کوئی ابتداء بھی فرض کرنا پڑے گی۔ اب اگر وجود کی ابتداء وجود سے ہوئی تو حقیقتاً ابتدا ہی نہیں ہوئی اور اگر وجود کی ابتدا عدم سے ہوئی تو یہ ممتنع ہے اس لئے کہ لاشے سے شے کا پیدا ہونا محال ہے لہذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ کوئی شے موجود نہیں ہے۔

دوسرے نظریہ کی تائید میں وہ یہ استدلال پیش کرتا ہے کہ چونکہ حواسِ خمسہ کی غلطیوں کا اعتراف تمام فلاسفہ کو ہے اور چونکہ عقل حواسِ خمسہ کی مدد کے بغیر کسی شے کا ادراک کرنے سے قاصر ہے لہذا عقل کو معیارِ حق و باطل سمجھنا " بناء الفاسد علی الفاسد" کے مترادف ہے اور ہم ہر شے کے علم و ادراک سے قاصر ہیں۔

تیسرے نظریہ کی تائید میں اس نے اس دلیل سے کام لیا ہے کہ چونکہ عقل حواسِ خمسہ کی مدد کے بغیر کسی شے کا تصور کرنے سے قاصر ہے اور چونکہ احساسات دوسروں کو منتقل نہیں کئے جا سکتے، لہذا اگر کسی شے کا علم حاصل بھی ہو تو وہ معرضِ بیان میں نہیں لایا جا سکتا[3]۔

بروطاغورث کے متبعین نے اس کے برعکس اخلاقی اقدار میں بھی کلام کیا اور یہ استدلال پیش کیا کہ جب کسی شے کا وجود نہیں ہے تو پھر خیر و شر کا بھی خارج میں وجود نہیں ہے بالفاظِ دیگر حسن و قبح عقلی نہیں ہے۔ اُن میں سے بعض کی یہ رائے تھی کہ اخلاقی احکام کمزور افراد نے وضع کئے تاکہ وہ ان کے سہارے سے قوی افراد کے ظلم سے محفوظ رہ سکیں اور بعض سوفسطائیوں کا خیال تھا کہ اخلاقی احکام قوی تر افراد نے بنائے تاکہ وہ ان کے ذریعہ سے عوام پر حکومت کر سکیں[4]۔

ظاہر ہے کہ تشکیک کی اس دنیا میں تصورِ الٰہ کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا تھا اور بروطاغورث نے دیوتاؤں کے متعلق اپنی اس کتاب میں جس کی تصنیف کے جرم میں اُس کو جلاوطنی کی سزا دی گئی تھی صاف صاف تحریر کیا کہ " چونکہ موضوع مبہم ہے اور انسان کی عمر قلیل لہذا نہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ دیوتا ہیں اور نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ دیوتا نہیں ہیں[5]"۔

برٹرنڈ رسل نے بروطاغورث کے اس قول کی صحت کو تو تسلیم کیا ہے مگر اُن کی نظر میں بروطاغورث پر الحاد کے جرم میں مقدمہ چلانے کی روایت صحیح نہیں ہے اور ممکن ہے کہ جس طرح بعد کے فلاسفہ نے سقراط کی راہِ حق میں شہادت کی حکایت تصنیف کر لی اسی طرح بروطاغورث کے معتقدین نے اُس کی فضیلت ثابت کرنے کے لئے یہ روایت وضع کر لی ہو۔ برٹرنڈ رسل کا یہ استدلال بھی صحیح نظر آتا ہے کہ دیوتاؤں کے وجود میں شک کرنے کے باوجود بروطاغورث اخلاقی نظام قایم رکھنے کے لئے دیوتاؤں کی پرستش لازمی سمجھتا تھا[6]۔ مجھے اس صف میں بروطاغورث تنہا نظر نہیں آتا بلکہ اُس کے ساتھ فلاسفہ کا ایک کثیر گروہ بھی دکھائی دیتا ہے جو خدا کو نہ ماننے کے باوجود صرف اخلاقی اقدار کو قایم رکھنے کے لئے دل سے نہیں بلکہ زبان سے خدا کے وجود کا اقرار کرتا ہے۔ بروطاغورث کی ولادت کے سال کی طرح اس کی وفات کے سال کو بھی یورپ کی تحقیق

---

[1] A History of Philosophy By Thilly page 57
[2] A History of Philosophy By Thilly pp. 57-58
[3] A Critical History of Greek Philosophy pp. 117-118
[4] A History of Philosophy By Thilly page 59
[5] A Critical History of Greek Philosophy page 112
[6] A History of Western Philosophy p. 97.

اختلاف سے بچانے میں ناکام رہی یعنی جس طرح برٹرنڈرسل کے قول کے مطابق بروطاغورث ۵۰۰ ق۔م کے قریب پیدا ہوا[1] پروفیسر اسٹیس کی تحقیق کے مطابق ۴۸۰ ق۔م میں پیدا ہوا[2] اور جرمن فلسفی ڈاکٹر ولیہلم نیسل کے خیال میں ۴۸۰ ق۔م یا اس سے کچھ پہلے پیدا ہوا۔[3] اسی طرح ڈاکٹر الفریڈ ویبر کے نزدیک ۴۱۱ ق۔م میں بروطاغورث کو جلاوطن کیا گیا اور اس کے تصانیف مجمع عام کے روبرو نذرِ آتش کئے گئے۔[4] مسٹر بین کے خیال میں بروطاغورث کی وفات ۴۱۱ ق۔م میں ہوئی[5] اور پروفیسر اسٹیس کی تحقیق کے مطابق ۴۱۰ ق۔م میں رسل اس پر الحاد کا مقدمہ دائر ہونے کو غلط سمجھتے ہیں[6] اور پروفیسر ٹلی اس واقعہ کے متعلق قلم کو جنبش ہی نہیں دیتے۔

بہرنوع بروطاغورث کا سالِ ولادت و وفات جو کچھ بھی ہو اور اُس پر الحاد کا مقدمہ دائر ہوا ہو یا نہ ہوا ہو اس نے ہیراقلیطس کی اس تعلیم سے کہ چونکہ ہر شے تغیر پذیر ہے لہذا ہر شے ہے بھی اور نہیں بھی ہے[7] پورا منطقی فایدہ حاصل کیا اور متاخرین میں سے شاید کوئی ایک فلسفی بھی ایسا نہیں جس نے اس کی موافقت کا کیا ذکر مخالفت کے باوجود اس کے نظریۂ ارتیاب کو کسی نہ کسی حد تک قبول نہ کیا ہو رہا عصرِ حاضر تو پروفیسر اسٹیس نے سوفسطائیوں کو صحیح معنوں میں فلسفی نہ ماننے[8] کے باوجود یہ تسلیم کیا ہے کہ موجودہ عصر کے مفکرین پر سوفسطائی خیالات و رجحانات چھائے ہوئے ہیں[9]۔

(۱۱) سقراط

سقراط کے متعلق یہ تو معلوم ہے کہ وہ ۴۶۹ ق۔م میں پیدا ہوا اور ۳۹۹ ق۔م میں اُسے زہر سے ہلاک کر دیا گیا[10] لیکن چونکہ سقراط نے خود کبھی نہیں لکھا اور سقراط کے دو شاگردوں (یعنی افلاطون اور زینوفون) میں باہم اختلاف ہے لہذا اب تک اس امر کا فیصلہ نہ کیا جا سکا کہ سقراط کی وہ تصویر صحیح ہے جو افلاطون نے پیش کی یا وہ تصویر ٹھیک ہے جو زینوفون نے پیش کی[11]۔

بعض محققین نے زینوفون کے بیانات کو اس لئے ترجیح دی کہ وہ ایک اکھڑ سپاہی تھا اور اس میں اتنی عقل تھی ہی نہیں کہ وہ غلط اقوال یا نظریات کو سقراط کی طرف منسوب کر سکے، لیکن دوسرے محققین نے زینوفون کے بیانات کو اس وجہ سے قابلِ اعتناء نہیں سمجھا کہ زینوفون ایک کم استعداد انسان تھا اور ایک کم استعداد شخص کے لئے کسی قابل فلسفی کے خیالات و نظریات کو سمجھنا اور پھر انھیں بے کم و کاست معرضِ تحریر میں لانا محال ہے[12]۔[13]

زینوفون کی کم استعدادی کی طرح افلاطون کی بے پناہ قابلیت بھی محققین کے لئے سنگِ راہ ثابت ہوئی اور وہ یہ فیصلہ نہ کر سکے

---

[1] A History of Western Philosophy page 97
[2] A Critical History of Greek Philosophy p. 112
[3] "مختصر تاریخ فلسفۂ یونان" صفحہ ۴۰
[4] History of Philosophy By Weber page 40
[5] History of Ancient Philosophy page 40
[6] A Critical History of Greek Philosophy p. 112
[7] A History of Western Philosophy page 97
[8] A Critical History of Greek Philosophy p. 74
[9] A Critical History of Greek Philosophy p. 110
[10] Ibid p. 124
[11] A History of Philosophy By Thilly pp. 62-63
[12] A History of Western Philosophy page 102
[13] Ibid page 103

کہ افلاطون کے مکالمات میں سقراط کے نظریات ہیں یا خود افلاطون کے[1] اور شاید اسی وجہ سے پروفیسر الفریڈ ویبر نے سقراط کو متقدمین سے کم تر تصور کیا۔ موصوف کی رائے میں سقراط کی اہمیت اس کی شہادت کی وجہ سے ہوگئی ورنہ جہاں تک علم و فضل کا سوال ہے اس سے قبل کے فلاسفہ اُس سے یقیناً بہتر تھے[2]۔

سقراط کی موت یقیناً زہر خورانی سے واقع ہوئی لیکن یہ سوال غور طلب ہے کہ سقراط کی موت کی سزا الحاد کے جُرم میں دی گئی یا سیاسی جُرم میں ؟

اس سوال کے جواب کے لئے سقراط کے عصر کے مذہبی اور سیاسی پس منظر پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے ! اوراق گزشتہ میں بیان کیا جا چکا ہے کہ عقیدۂ کثرت رفتہ رفتہ عقیدۂ وحدت کی صورت اختیار کر رہا تھا یعنی بے شمار دیوی دیوتاؤں کے بجائے یا تو آتش و آب و خاک و باد میں سے کسی ایک کو اصل کائنات سمجھا جا رہا تھا یا چاروں کو اور کائنات کا محرک یا تو عشق کو تسلیم کیا جا رہا تھا یا سالمات کی ذاتی قوت یا دماغ کو۔ اس سلسلہ میں اولمپین دیوتاؤں کے حیا سوز افعال کا مذاق بھی اُڑایا جاتا تھا لیکن ان مذاق اُڑانے والوں کو نہ حکومت سزا دیتی تھی اور نہ عوام۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اگر مذہبی اختلاف کے ساتھ ساتھ کوئی اہم سیاسی اختلاف بھی شامل ہوتا تھا تو دیوتاؤں کے منکر فلاسفہ کو زینوفینیز کی طرح آزاد نہیں چھوڑا جاتا تھا بلکہ انیکساغورث اور بروطاغورث کی طرح الحاد کے جُرم میں دراصل سیاسی جُرم کی سزا دی جاتی تھی۔

جہاں تک الحاد کا سوال ہے سقراط کا دامن اس سے قطعاً پاک تھا یعنی یا تو وہ ایتھنز کے باشندوں کے مذہبی عقائد کی ہم نوائی کرتا تھا اور علی الاعلان زیوس دیوتا اور دیوتاؤں کے وجود کا اقرار کر کے ان کے نام کی قسمیں کھاتا تھا[3] بلکہ دیوتاؤں کے نہ ماننے کے جُرم کی ان پر زور الفاظ میں صفائی پیش کرتا تھا۔ "تم الزام لگاتے ہو کہ سقراط پُرانے دیوتاؤں کو چھوڑ کر نئے دیوتا کی پرستش کرتا ہے، لیکن تم یہ غور نہیں کرتے کہ اگر میں ارواح یعنی چھوٹے دیوتاؤں کو مانتا ہوں جو بڑے دیوتاؤں کی اولاد ہیں تو پھر میں بڑے دیوتاؤں کے وجود کا منکر کیونکر ہو سکتا ہوں؟ کیا کوئی صحیح الدماغ انسان گھوڑے اور گدھے کے وجود سے منکر ہو کر خچر کے وجود کا مدعی بن سکتا ہے"[4] اور یا پھر سقراط کائناتی اور مابعد الطبیعیاتی مسایل پر غور و خوض کو حماقت سمجھتا تھا[5]۔ یعنی جہاں تک مذہبی معتقدات کا سوال تھا ایتھنز کے باشندوں کو سقراط سے کوئی خاص وجہ شکایت نہیں ہو سکتی تھی۔ ہاں سیاسی پس منظر دیکھنے کے بعد یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ سقراط کو سزا دینے کے لئے اس کے سیاسی جُرم کو مذہبی جُرم کا بہانہ قرار دیا گیا۔ ایتھنز کی حکومت جمہوری تھی اور اس میں فوجی جرنل بھی انتخاب عام کے ذریعہ سے مقرر کئے جاتے تھے اس کے برعکس اسپارٹا کی حکومت معدودے چند افراد کے ہاتھ میں تھی ان دونوں حکومتوں میں سیاسی رقابت بھی تھی اور اصولِ حکومت کا اختلاف بھی اور یہ مخالفت طویل جنگوں کی صورت اختیار کر چکی تھی جن میں بحری تفوق تو ایتھنز کی حکومت کو حاصل رہا تھا لیکن خشکی کے محاربات میں فتح اسپارٹا والوں کے حصے میں آتی تھی اور اسپارٹا کی افواج نے ایتھنز کو چھوڑ کر اٹیکا کے پورے علاقہ پر متعدد بار قبضہ کیا تھا۔ ۴۱۴ ق۔م میں ایتھنز کی حکومت نے اسپارٹا کے حلیف جزیرۂ سسلی پر حملہ کیا لیکن انھیں ناکامیابی کا منہ دیکھنا پڑا اور ۴۰۵ ق۔م کی بحری جنگ نے ایتھنز کے بحری تفوق کا بھی خاتمہ کر دیا۔ جنگ کے اختتام پر اسپارٹا والوں نے ایتھنز کی حکومت جمہور کے بجائے اپنے پسندیدہ تیس افراد کے سپرد کر دی۔ ان تیس افراد کو تاریخ

---

1. A History of Philosophy By Thilly page 64
2. History of Philosophy page 49
3. The Philosophy of Plato ; Jowett's Translation pp. 64, 70
4. Ibid pages 70-71
5. A History of Philosophy By Thilly page 68

تیس ظالموں کے نام سے یاد کرتی ہے اور ان تیس ظالموں کا سردار کری ٹیاس، سقراط کا شاگرد تھا اور کری ٹیاس کے علاوہ بھی اس ظالم حکومت کے چند اور ارکان سقراط کے شاگرد تھے۔ عوام نے ایک سال کے اندر اس ظالم حکومت کا تختہ تو اُلٹ دیا اور اسپارٹا کی حکومت سے رضامندی حاصل کرنے کے بعد جمہوری طرز کی حکومت تو قایم کرلی لیکن اسپارٹا کے خوف کی وجہ سے ایتھنز کی حکومت کو ہر سیاسی مجرم کے لئے عام معافی کا اعلان کرنا پڑا اور انتقام کی صرف یہی صورت باقی رہ گئی کہ سیاسی مجرموں کو سیاست کے علاوہ کسی اور جرم میں سزا دی جائے۔ یہ تھا وہ سیاسی پس منظر جس کے تحت ۳۹۹ ق۔م میں سقراط پر الحاد کا مقدمہ چلایا گیا[1]۔ سقراط کے جو بیانات افلاطون نے اپالوجی نامی مکالمے میں درج کئے ہیں اُن سے بھی یہ مترشح ہوتا ہے کہ سقراط اپنے آپ کو ان تیس ظالموں سے بے تعلق ظاہر کرنا چاہتا تھا اور یہ دکھانا چاہتا تھا کہ جس طرح جمہوری حکومت کے دور میں سقراط مصائب کا شکار رہا اسی طرح تیس ظالموں کے عہدِ حکومت میں بھی آلام سے دوچار رہا اور ہر زمانہ میں سقراط نے موت کی پروا نہ کرکے حق و انصاف کا ساتھ دیا[2]۔

ان شواہد کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یا تو سقراط کا تصور الٰہ ایتھنز کے باشندوں کی طرح تعدد الٰہ کے عقیدے کی طرف مایل تھا اور یا کم از کم مابعد الطبیعیات کے بارے میں وہ سوفسطائیوں کا ہم نوا تھا اور تصورِ الٰہ کا نہ منکر تھا نہ مقر[3]۔

در اصل اس کا مقصدِ حیات یہ تھا کہ سوفسطائیوں نے جو شک اخلاقیات میں پیدا کیا ہے اسے فلسفیانہ دلایل سے رد کرے اور اسی وجہ سے جن محققین نے افلاطون کے ابتدائی مکالمات کو سقراط کے خیالات کا آئینہ سمجھا ہے انھوں نے اس امر کی بھی تصریح کی ہے کہ ان مکالمات میں صرف اخلاقی صفات مثلاً شجاعت۔ اعتدال۔ علم وغیرہ کا وجود ثابت کیا گیا ہے اور اپنے بیان کے ثبوت میں ارسطو کی مابعد الطبیعیات کا یہ اقتباس بھی پیش کیا ہے کہ سقراط صرف اخلاقیات سے سروکار رکھتا تھا[4]۔ (باقی)

---

[1] A History of Western Philosophy pages 100-101
[2] The Philosophy of Plato Jowett's Trans. pp. 77-78
[3] A History of Philosophy By Thilly page 68
[4] God & The World. By Prof. Forsyth pages 14-15

گلہائے پریشاں

آراستہ الیاس احمد (ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج)

ضخامت کتاب ۵۰۸ صفحات۔ تقطیع بڑی۔ قیمت سات روپیہ آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:۔ **کتابستان۔ الہ آباد**

"گلہائے پریشاں" فارسی اور اُردو شعراء کے چوٹی کے کلام کا بے مثل گلدستہ ہے۔ آغاز عشق سے انجام عشق تک جتنے مراحل پیش آتے ہیں اُنکے متعلق سرخیاں قایم کی گئی ہیں اور چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار ہر سرخی کے تحت میں تقدم و تاخر کے لحاظ سے درج ہیں۔ مراحل محبت کی سرخیوں کے علاوہ خمریات، مذہبیات، اخلاقیات وغیرہ کے متعلق بھی سرخیاں قایم کی گئی ہیں۔ سرخیاں سیکڑوں ہیں۔ اگر کسی شعر کے متعلق کوئی لطیفہ درج ہے۔ اساتذۂ سابق کی تیس تصویریں بھی کتاب میں شامل ہیں۔

اُردو ادب میں یہ کتاب ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ اہلِ ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ"

ہندی کا ایک جلیل القدر مسلمان شاعر

(سید غلام نبی بلگرامی ، المتخلص بہ رسؔ لین)

(مقیت الحسن)

بلگرام ، ضلع ہردوئی (یوپی) کا مشہور و معروف قصبہ ہے اور اپنی مردم خیزی کے باعث ہمیشہ ممتاز رہا ہے - رسؔ لین اسی بلگرام کے ایک سپوت تھے جو ۱۶۴۶ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے - آپ کی تاریخ ولادت میں بہت اختلاف ہے - بعض نے ۱۶۴۰ء اور کسی نے ۱۶۹۸ء بتایا ہے - آپ میر عبدالجلیل بلگرامی کے بھانجے اور میر محمد باقر کے صاحبزادے تھے - جناب مقبول احمد صمدانی اپنی کتاب " حیات جلیل یعنی تذکرہ علامہ میر عبدالجلیل بلگرامی " میں رسؔ لین کے بارے میں لکھتے ہیں : " میر غلام نبی، میر صاحب (عبدالجلیل بلگرامی) کے خواہر زادے بلگرام میں ۲ محرم ۱۱۱۱ھ مطابق ۱۶۹۹ء کو تولد ہوئے - میر صاحب کو خبر پہونچی تو تاریخ نکالنے کی فکر ہوئی - اسی خیال میں سو گئے - عالم رویا میں بچہ کی صورت نظر آئی جو کہہ رہا تھا " نور چشم باقر عبدالحمیدم " بیدار ہونے پر اعداد کا شمار کیا تو پوری تاریخ تھی - میر صاحب نے یہ پیش گوئی کی کہ مولود مسعود شاعر ہوگا اور یہ پیشین گوئی پوری ہوئی - نبی تخلص تھا - موسیقی کے بھی ماہر تھے اور میرزا جان جاناں مظہر دہلوی ہندی شاعری میں اُن کے شاگرد تھے " مقبول احمد صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ رسؔ لین عربی و فارسی زبانوں میں بھی شاعری کرتے تھے اور نبی تخلص فرماتے تھے - شعر و ادب کے علاوہ موسیقی سے بھی لگاؤ تھا - زمانہ کے دستور کے مطابق عربی فارسی کی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی اور اُس میں دستگاہ کامل بہم پہونچانے کے بعد سنسکرت ، ہندی اور برج بھاشا کی طرف رجوع کیا اور اس میں بھی کمال حاصل کیا -

ہندی شاعری میں دوہا ایک بہت مشہور صنف سخن ہے کہتے ہیں بہاری لال چوبے اس صنف سخن کا ماہر گزرا ہے - کوئی شاعر اس میدان میں اُس کی ہمسری نہ کر سکا مگر ایک رسؔ لین جن کے دوہے اتنے اونچے اور بلند آہنگ ہوتے ہیں کہ اُن پر بہاری لال کا شبہ ہونے لگتا ہے - ذیل کا دوہا عام طور سے بہاری کے نام سے منسوب ہے ، حالانکہ وہ رسؔ لین ہی کا ہے :-

اٹی ہلاہل بدھ بھرے سیت شیام رتنار
جیت مرت جھک جھک پرت جیہہ چیتوت ایک بار

رسؔ لین جس دور ادب میں پیدا ہوئے وہ صنعت کاری کا دور تھا - فارسی ملک کی شاہی زبان تھی اور فارسی ادب ملک پر چھایا ہوا تھا - ہر زبان اس سے متاثر ہو رہی تھی اور ہر ادب نظم و نثر میں اس کی تقلید کر رہا تھا - جس طرح فارسی شاعری اُس وقت معشوق کے خال و خط اور عارض و گیسو کی تعریف میں رطب اللسان تھی اور ہر شاعر حدیث بادہ و مینا و جام میں مشغول تھا اُسی طرح اُس دور کی ہندی شاعری بھی پیار پریم اور سرنگار میں مشغول تھی اور اس کے شعراء سراپا نگاری میں مصروف - ہندی ادب کے اس دور کو " ریتی کال " کہتے ہیں — رسؔ لین اسی دور میں پیدا ہوئے اس لئے ان کی شاعری میں وہ تمام رجحانات موجود ہیں جو اس دور سے مخصوص تھیں -

رسؔ لین نے برج بھاشا میں دو تصانیف چھوڑی ہیں — (۱) " انگ درپن " (سراپا) جس میں جسم محبوب کے سارے

اعضاء کا تشبیہی بیان کیا گیا اور معشوق کا سراپا لفظی صنعت گری کے ساتھ کھینچا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۷۳۷ء یا ۱۷۹۴ء میں لکھی گئی تھی اس میں ۱۷۷ دوہے ہیں۔ رس لین کی تصانیف میں یہ کتاب سب سے زیادہ مقبول ہے ۔ (۲) دوسری تصنیف "رس پربودھ" ہے جو ۱۷۹۸ء میں لکھی گئی۔ اس کا سال تصنیف ۱۷۴۱ء ہے۔ یہ کتاب رس، بھاؤ، نائیکا بھید، چھ موسم اور بارہ ماسہ پر ایک منظوم شاہکار ہے۔ اس میں کل ۵۵ ۱۱ دوہے ہیں مگر یہ چھوٹی سی کتاب اس فن پر اتنی اہم ہے کہ ہر ناقد سخن نے اس کی تعریف کی ہے۔

رس لین کا عام انداز سخن سیدھا سادا اور سہل ہوتا ہے۔ ان کے اشعار سمجھنے کے لئے ذہن پر زور نہیں دینا پڑتا۔ جو کچھ کہتے ہیں پورے طور پر محسوس کر کے بے ساختہ طریقے سے کہتے ہیں۔ زبان پر اتنی قدرت ہے کہ مشکل سے مشکل مضمون کو بھی بڑے سہل انداز میں ادا کر جاتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات کے بادشاہ ہیں اور سراپا نگاری میں ماہر۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

چکھ چلی، سرون ملیو چہت کچ بڑھی چھو چھوان
کٹی تج درب دھر یو چھت بکشتھل میں آن

اُس کی بڑی بڑی آنکھوں کا یہ حال ہے کہ جیسے پھیل کر کانوں تک جا پہونچیں گی اور زلف اس قدر لانبی ہے کہ معلوم ہوتا ہے اب زمین چھو لیگی۔ کمر اس لئے پتلی ہو گئی ہے کہ اس کا سونا سمیٹ کر اُس کی چھاتی میں بھر دیا ہے۔

مکت بھئے گھر کھوئے کے کان بیٹھے جائے،
گھر کھوت ہیں اور کے کیجئے کون اپائے،

موتیوں نے اپنا گھر چھوڑ کر کانوں میں اپنا مقام بنا لیا ہے۔ اب وہ محبوب کے حسن کو چمکا کر دوسروں کا گھر برباد کر رہے ہیں۔ اس کا کیا علاج ؟

لکھ سسی نرکھی چکور ارو تن پا دیپ لکھی مین
پد پنکج دیکھت بھنور ہونت نین رس لین

اُس کے چاند جیسے مکھڑے کو دیکھ کر چکور حیران ہے اور اُس کے پانی جیسے صاف شفاف جسم پر مچھلی فدا ہے۔ اور میری آنکھوں کا یہ حال ہے رس لین! کہ اس کے کنول جیسے پاؤں کو ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہی ہیں گویا بھنورے کی طرح اُس کے چاروں طرف پھرتی ہیں اور وہاں سے ہٹنے کا نام نہیں لیتیں۔

کت دکھائے کامنی دی دامنی کو نچ بانھ
تھر تھرات سی تن پھرے پھر پھرات گھن ماہ،

کامنی نے اپنی بانھ کھول کر بجلی کو کیوں دکھائی کہ اس کو بادل میں چین نہیں ملتا اور وہ تڑپتی پھر رہی ہے۔

پتی ورتا یا شوہر پرستی کا یہ حال تھا کہ غیر محرم سے باتیں کرنا اور اس کی شکل دیکھنا تو دور کی بات ہے اُس کے سائے تک سے احتراز کیا جاتا تھا۔ اور اس ضمن میں جو اہتمام ہوتا تھا ملاحظہ ہو:۔

دھرت نہ چو کی نگ جری، یا تیں اور میلائے
چھا پنچھ پڑے پر پرا ش کی نچ تئے دھرم نسائے

وہ ناک اور شیشہ جڑے ہوئے تخت پر اس لئے نہیں بیٹھتی کہ مبادا کسی غیر محرم کا عکس اُس میں دیکھائی دے اور اس طرح دھرم خراب ہو۔

پئی مورتی میری سدا راکھت دریگن بسائے
ڈرپتی گوری دیہہ یہ مت کاری ہو جائے

درگین[1] = آنکھ - ایک دوشیزہ اپنی سہیلی سے کہتی ہے - سکھی ری! میرا محبوب مجھے ہمیشہ اپنی آنکھوں میں بسائے رکھتا ہے - ڈرتی ہوں کہ کہیں میرا رنگ ہی کالا نہ ہو جائے -

ہوں نہ سہوں گی بات الی[1] تو سوں کہوں نینگ
میرے مکھ کو چند کہی لاوت لال[2] کلنک

[1] الی بمعنی سکھی -
[2] لال کا اشارہ محبوب کی طرف ہے - سکھی ری! میں اُس کی (محبوب) باتوں کو کبھی برداشت نہیں کر سکتی وہ میرے چہرے کو چاند سے تشبیہ دیتا ہے جو داغدار ہے -

کمت چند پرتی دیوس بڑھی، ماس ماس کڑھیائے
تو وُکھ مدھرائی لکھے پھیکو پڑ، گھٹی جائے

چاند جو ہر مہینہ بڑھتا گھٹتا رہتا ہے تم (اے میرے محبوب!) جانتے ہو کیوں ایسا ہوتا ہے - بات دراصل یہ ہے کہ جب وہ اول اول نکلتا ہے تو اپنے غرورِ حسن میں بڑھتا ہی جاتا ہے - پھر ایک بار جب تمھارے چہرے پر نظر پڑ جاتی ہے تو مارے شرم کے پھیکا پڑ جاتا ہے اور گھٹنا شروع ہوتا ہے -

تج سنگھاسن راج ارو، آسن اک بسیکھ[1]
چھٹے نہ آسن کون کو بھئوں سراسن[2] دیکھ

[1] آسن اک بسکھ = تپسیا کا ایک آسن جس میں جوگی لوگ سانس بند کر کے ایک پیر پر کھڑے رہتے ہیں -
[2] سراسن بمعنی کمان -
بادشاہ ہو یا فقیر تیرے تیرِ مژگاں اور کمانِ ابرو سے اے میرے محبوب! کوئی شخص بچکر نہیں نکل سکتا - سب ہی زخمی ہو جاتے ہیں -

تی[1] سے سوئو[2] جو بن ملے بھید نہ جانیو جات
پرات[3] سمئے نیسی[4] دیوس[5] کے دو بھاؤ درسات[6]

[1] تی بمعنی دوشیزہ ، [2] سے سوئو یعنی لڑکپن ، [3] پرات بمعنی صبح ، [4] نیسی یعنی رات ، [5] دیوس = دن ، [6] درسات = معلوم ہوتے ہیں -
کلی پر کلی اور پھول بننے کے درمیان ایک ایسا وقفہ آتا ہے جب نہ تو اسے کلی کہہ سکتے ہیں نہ پھول یہی حال اُس کا ہوتا ہے جس کا لڑکپن بیت رہا ہو اور جوانی دبے پاؤں داخل ہو رہی ہو - رس کین کہتے ہیں اُس دوشیزہ کی نوجوانی کا عالم یہ معلوم ہوتا ہے جیسے جوانی سے بچپن گلے مل رہا ہو اور اسے نہ تو جوان کہہ سکیں نہ بچہ اس وقت اس پر وہی سماں بندھ رہا ہے جو صبح صادق کے وقت جاتی رات اور آتے دن کا ہوتا ہے -

لاج وتی، پردیس تے پی آئیو، سدھ پائے
نسدن مدھ کمل لوں بکست سکچت جائے

ساجن پردیس سے آئے، یہ خبر پاکر شرم کی ماری بے چاری کبھی تو خوشی سے کنول کی طرح کھل اُٹھتی ہے اور کبھی لاج کے مارے مرجھا جاتی ہے -

رہنی من پاوت نہیں لاج پریت کو انت
دوہوں اور انیچو رہے جیمی بی بی تی کو کنت

مصحفی اور داغ

داغ کا کلام بظاہر دلی کے رنگ سے بالکل الگ نظر آتا ہے اس لئے بعض لوگ ان کی شاعری کا سلسلہ جرأت سے ملاتے ہیں اور انکی شاعری کی تاریخ جرأت کے زمانہ سے شروع کرتے ہیں لیکن ان کے نزدیک بھی باوجود اس اشتراک کے داغ اور جرأت کے رنگ میں نمایاں فرق و امتیاز موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جرأت اور انشاء سے پہلے غزل گوئی کے دو مختلف رنگ قایم ہو چکے تھے ایک خواجہ میر درد، میر اثر اور راسخ کا رنگ تھا جس میں محبت حقیقی کے پاک جذبات نہایت مہذب الفاظ میں ادا کئے جاتے تھے اس لئے اس رنگ کو تصوف اور معرفت سے گہرا تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ دوسرا رنگ میر تقی میر کا تھا، جس میں عشق حقیقی کے ساتھ عشق مجازی کے پاک جذبات بھی شامل ہو گئے تھے اور سودا، قایم، یقین، میر حسن اور بیان وغیرہ کا بھی قریب قریب یہی انداز تھا، قدماء کے تیسرے دور میں مصحفی نے بھی یہی روش اختیار کی تھی اور تغزل کا بہترین نمونہ قایم کر دیا تھا لیکن جرأت اور انشاء نے اس سے آگے قدم بڑھایا اور شاعری میں رندی و ہوسناکی کے جذبات کا عنصر غالب کر دیا، اور یہیں سے اس معاملہ بندی کی بنیاد قایم ہوئی جس پر متاخرین شعرائے لکھنؤ نے بلند عمارتیں کھڑی کر دیں۔ (گلِ رعنا)

لیکن بایں ہمہ اب تک میر کے تغزل کا اثر باقی تھا اس لئے جرأت کے کلام میں بھی میر کے تغزل کا ایک حصہ شامل ہے۔ خصوصاً عاشقی و معشوقی کے باہمی تعلقات کو جس خوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ مسلسل غزلوں میں ظاہر کیا گیا ہے وہ جرأت ہی کا حصہ ہے۔ ان کے مقلدین یہ کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ سچ ہے کہ جرأت کے یہاں بعض عریاں شعر بھی پائے جاتے ہیں، لیکن اس قسم کے اشعار بھی داغ کے رنگ سے بالکل الگ ہیں۔ اس بناء پر داغ کا سلسلہ جرأت و انشاء سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے اور وہ بظاہر آتش کے تلامذہ سے جا کر ملتا ہے۔ جنھوں نے عشق و محبت کے آداب کو بالائے طاق رکھ کر معشوق سے بے محابا گفتگو کرنے سے پرہیز نہیں کیا۔

جو باتیں داغ کے خوشنما کلام میں بدنمائی کا پیوند لگاتی ہیں وہ تمام تلامذۂ آتش کے یہاں موجود ہیں لیکن اُن کا رنگ اس قدر شوخ و ہموار نہیں ہے اور رعایت لفظی کے گورکھ دھندے اور گنجھی چوٹی کے اُلجھاؤ سے بھی نہیں نکلا مبتذل اشعار کی کثیر تعداد بھی موجود ہے۔ البتہ داغ نے اس دریا کو اس قسم کے خس و خاشاک سے اس قدر پاک کر دیا ہے کہ یہ تنکے ان کی کشتی کی روانی میں مطلق رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتے۔

یہ کہنا بعید از حقیقت ہے کہ داغ کا کلام تمام و کمال دلی کے رنگ سے علٰحدہ ہو گیا کیونکہ اس میں جابجا متغزلانہ اور صوفیانہ رنگ کے بلند پایہ اشعار بھی نظر آتے ہیں اور متوسطین کے دور میں دلی کے شاعروں نے شعرائے فارسی کی تقلید میں جو اندازِ بیان اختیار کیا تھا داغ نے بھی صفائی و برجستگی کے اضافہ کے ساتھ اسی کو قایم و برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

معاملات عاشقانہ کے اظہار میں مرزا داغ کا نام حد سے زیادہ بدنام ہے اور اس میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں کہ اُردو کے کسی شاعر نے اس کثرت کے ساتھ مضامین عشقیہ کو اپنے کلام کا مقصود حقیقی نہیں گردانا۔ داغ کے تمام دیوانوں کی پرتال کی جائے تو کم از کم سیکڑوں اشعار ایسے نکلیں گے جن میں وصل و ہجر، شکوہ و شکایت اور رشک و رقابت کے نہایت کھلے کھلے نقشے کھینچے گئے ہوں۔ حتیٰ کہ جلی کٹی۔ طعن و تشنیع، چھیڑ چھاڑ، لاگ ڈانٹ چھین جھپٹ وغیرہ رکیک مضامین وغیرہ سے احتراز نہیں کیا گیا۔ انتہا یہ ہے کہ بعض بعض مقامات پر معشوق کو ایسی کھری کھری سنائی گئی ہیں جن کا بار سچی عاشقانہ شاعری کے کاندھوں سے نہیں اُٹھ سکتا۔ ایسے تمام اشعار کا طرز بیان نہایت ہلکا، خارج از تہذیب اور غیر سنجیدہ ہے جو تعلیم یافتہ

گروہ میں لایق پذیرائی نہیں اور مہذب سوسائٹیاں اپنے گوش شنوا کو تکلیف شنوائی اُٹھانے کے لئے مجبور نہیں کرتیں۔

داغ کی نگاہ میں معشوق کی کوئی حیثیت اور عشق کا کوئی مرتبہ نہ تھا وہ محبت کو تفریح کا ایک مشغلہ اور شاعری کو تفنن طبع کا وسیلہ سمجھتے تھے شاید ایسا شعر داغ کے سوا کوئی اور نہیں کہہ سکتا ؎

تم کہتے ہو معشوق اطاعت نہیں کرتے　　عاشق بھی تو معشوق کا نوکر نہیں ہوتا

دُنیائے عشق میں غیر اور رقیب کا وجود ویسے ہی ناقابل برداشت سمجھا جاتا ہے چہ جائیکہ معشوق کے ساتھ اس کا خلا ملا، لیکن مرزا داغ کا ظرفِ عشق اس کو ٹھنڈے دل سے گوارا کرنے کے لئے طیار ہے اور اس واقعہ سے تیور پر بل آنے کے بدلے صرف تیکھے پن کے ساتھ شکوہ کر دینا کافی ہے ؎

تم کو ہے وصلِ غیر سے انکار　　اور اگر ہم نے آ کے دیکھ لیا

اس لحاظ سے مرزا داغ کے کلام کو کسی ایسے شاعر کے کلام کے سامنے لانا جس کے دردانگیز خیالات لذت روح کا کافی سامان رکھتے ہوں صرف ناموزوں ہی نہیں بلکہ قابلِ اعتراض بھی ہے، البتہ صفائی، روانی، شوخی، برجستگی اور لطف زبان میں نواب مرزا خاں داغ نے اس قدر ناموری حاصل کی کہ متاخرین کے دور میں ان کا یہ رنگ مخصوص رنگ قرار پایا اور صرف ان کے مقبول عام کلام پر دلی کی شاعری کا انحصار رہ گیا۔ فقروں کا موسیقیت آمیز توازن جیسا داغ کے یہاں ہے اُردو شعراء میں شاید ہی کسی کو نصیب ہوا اور پھر شاذ و نادر نہیں بلکہ اکثر محاورات کا استعمال جس خوبصورتی کے ساتھ ان کے یہاں ہوا ہے اس کی نظیر ملنا دشوار ہے لطف زبان اور حسنِ بیان کے زور سے معمولی سے معمولی بات کو بڑی بات بنا کر پیش کر دینا کہ سننے والا یک لخت تڑپ اُٹھے صرف داغ کے عام فہم کلام کی خصوصیات میں داخل ہے حسن بندش سے پامال اور غیر مانوس طرحوں کو چمکا دینا داغ کا حصہ تھا اور ان کا دعویٰ بالکل حق بجانب معلوم ہوتا ہے کہ ؎

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ　　ہندوستان میں دھوم ہماری زباں کی ہے

مصحفی مرحوم کا معاملہ داغ سے بالکل برعکس ہے وہ معاملات عاشقانہ کو پورے جوش کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ لیکن احتیاط کے ساتھ کہ سننے والوں کے دل مزا لیتے ہیں اور پڑھنے والوں کی زبان سہر ہر لفظ پر بے ساختہ تحسین و آفرین کے پھول برساتی ہے۔

مصحفی مرحوم کی نگاہ میں عشق عشق ہے ہوا و ہوسی نہیں ہے۔ اس لئے ان کے خیال میں نہ معشوق اتنا ذلیل ہے کہ ہر کس و ناکس مقابلہ کا دعوے کر بیٹھے نہ عاشق اتنا کم ظرف کہ جا و بے جا معشوق کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جائے فرماتے ہیں:۔

کیا برا ہے کہ رہے مصحفی اب یاں دن رات　　تم یہی جانیو دربان ہے در پر رکھا

یوں دیکھتا ہوں دیدۂ حسرت سے اُس کو میں　　جیسے نظر گدا کی رخِ بادشاہ پر

معشوق اس کو کہتے ہیں بعد از ہزار سال　　آئے بھی خواب میں تو نہ بولے حجاب سے

تم ہم کو اپنا منہ نہ دکھاؤ تو خوب ہے　　پردہ میں اور چاہ بڑھاؤ تو خوب ہے

مصحفی کی آنکھ اول تو محفل دوست میں غیر کو دیکھنا گوارا نہیں کرتی اور اگر بفرض محال ایسا ہوتا بھی ہے تو اس کے اظہار کا مستحسن طریقہ یہ ہے ؎

غیر سے گرم ملو، ہم پہ یہ بیداد رہے　　اور تو کیا کہیں ہم تم سے مگر یاد رہے

ملاپ غیروں سے ہے ہم سے بے وفائی ہے　　یہ کون شیوہ ہے کیا رسم آشنائی ہے

مصحفی مرحوم اور مرزا داغ کے شاعرانہ کارناموں میں بعینہ وہ نسبت ہے جو روح اور مادے میں ہوا کرتی ہے یعنی شیخ مرحوم جب عاشقانہ شعر کہتے ہیں تو اپنی شاعری کو ہوا و ہوسی کے داغ سے پاک و صاف رکھتے ہیں اور معانی کے ساتھ الفاظ کو بھی ان حدود سے باہر نہیں نکلنے دیتے جو حقیقی شاعری کے چہرے کے لئے آرایش و زیبایش کا کام دیتے ہیں اور مرزا داغ قصداً و ارادتاً سامعین کے منہ سے واہ واہ حاصل کرنے کے لئے اُن خاردار جھاڑیوں میں ہو کر نکلتے ہیں جہاں ذرا سی بے احتیاطی دامنِ شاعری کو پُرزے پُرزے کرنے کے لئے

کافی ہوتی ہے - ذیل کے دو شعروں سے دونوں کا رنگ متمایز ہو سکتا ہے۔ مصحفی مرحوم کا شعر ہے ؎

لطف تب ہے کہ ہوا کھولتی جائے اسکو اور تم پردے میں منہ اپنا چھپاتے جاؤ

مرزا داغ اسی مضمون کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں ؎

یہ سیر ہے کہ دوپٹہ اڑا رہی ہے ہوا چھپاتے ہیں جو وہ سینہ کمر نہیں چھپتی

دونوں شعروں میں معشوق کی کیفیتِ پردہ پوشی اور ہوا کی سعی پردہ دری کا بیان ہے فرق صرف یہ ہے کہ مرزا داغ نے پردے کے بجائے دوپٹہ اور منہ کے بجائے سینہ کہہ کر شعر کو روحانیت کے درجہ سے مادیت کے درجہ میں تبدیل کر دیا ہے اور اس تغیر کے بعد وہی مضمون جو اصل حالت میں کوئی چیز تھا اس قدر عریاں اور سوقیانہ ہو گیا ہے کہ طبیعت کو انبساط کے بجائے انقباض ہوتا ہے۔

مصحفی مرحوم کی شاعری کا دائرہ نہ اس قدر مختصر ہے کہ ہم چند اوراق میں احاطہ کر لیں نہ ایسی کوئی ضرورت ہے کہ یہاں درج کرنا پڑے لیکن اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ انھوں نے عاشقانہ شاعری کو شاعری کی حیثیت سے اختیار کیا ہے اور جذبات و واردات کے اظہار کے ساتھ اپنی نقاہت و متانت کے دامن کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہنے میں اس استقلال و جواں مردی کا ثبوت دیا ہے جس کی نظیر دستیاب ہونا مشکل ہے محققین کی شہادتیں ان کے اوصاف کمال کی دستاویز پر مہریں ہیں جن کو زمین و آسمان کی گردش قیامت تک صفحۂ دہر سے محو نہیں کر سکتی۔ مولانا عبدالسلام کا یہ قول رہتی دنیا تک قایم رہے گا کہ "مصحفی بلاشبہ اپنے دور کے شعراء میں سب سے زیادہ متین، سب سے زیادہ مہذب اور سب سے زیادہ سنجیدہ ہیں" اور مولانا عبدالحی کے اس مقولہ کی صداقت روزِ روشن کی طرح آشکارا رہے گی کہ "مصحفی نے بھی یہی (میر تقی وغیرہ کی) روش اختیار کی تھی اور تغزل کا بہترین نمونہ قایم کر دیا تھا"

معنویت سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو الفاظ کی سلاست اور زبان کی نفاست میں بھی ان کے کلام کو معاصرین کے مقابلہ میں خاص تفوق و برتری حاصل ہے۔ شتر گربگی فحاشی جس کلام کو چھو کر نہ نکلی ہو اس کے اچھا ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

مصحفی مرحوم الفاظ کے نشیب و فراز، فقروں کے جوڑ توڑ اور جملوں کی تراش خراش سے بے خبر نہ تھے وہ مصلح زبان بھی تھے اور مصلحین کو اصلاح کا راستہ بتانے والے بھی اس لئے اگر ان کا کلام پستی و بلندی کے بدنما داغ سے مبرہ و منزہ ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے میں یہ دعوے نہیں کرتا کہ مصحفی کے تمام دواوین صفائی و برجستگی میں یکساں ہیں اور ان میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جسے سبک اور پست کہا جا سکے۔ میر تقی میر، میر زا غالب، میر درد وغیرہ جس قدر شعرا اپنی بلند پایہ شاعری کے واسطے مشہور ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسکے کلام کی یکسانیت معترضین کو زبان کھولنے سے باز رکھ سکے تو پھر مصحفی اس اصول سے کیسے باہر جا سکتے ہیں۔ البتہ دیکھنے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ آج زبان کی جس سلاست و روانی کے طفیل مرزا داغ کی شاعری فصیح الملک اور بلبلِ ہندوستان کے زریں تاج زیبِ سر رکھنے کا استحقاق رکھتی ہے اس کے نہایت دلکش نمونے اب سے ڈیڑھ سو برس پیشتر ایک استاد کے قلم معجز رقم سے نکل چکے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ نامساعدت روزگار نے ان جواہر پاروں کو ناقدری و کساد بازاری کے گرد و غبار سے بے آب کر کے اصل قیمت سے گرا دیا ہے، اپنی نگاہ سے تعصب، ہٹ دھرمی اور طرفداری کا پردہ اٹھا کر دیکھو کہ میرے بیان میں کس قدر صداقت ہے تم خود کہہ دو گے کہ جہاں مصحفی مرحوم نے سلاست و روانی اور برجستگی و بے ساختگی کے جوہر دکھائے ہیں وہاں اشعار کو ایک گلدستہ رنگا رنگ بنا کر رکھ دیا ہے جس میں فقروں کا توازن، ادائے مطلب کا تیکھا پن، بندش کی چستی، زبان و محاورے کی درستی، گلہائے سدا بہار کی طرح بے نقاب ہو کر دیکھنے والوں کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اس مختصر تمہید کے بعد ہر عنوان کے تحت میں چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

فقروں کی موسیقیت آمیز توازن مصحفی مرحوم کے کلام میں اس قدر ہے کہ انتخاب کرنا مشکل ہے، مرحوم نے اول تو غزلوں کے لئے بہت سی بحریں اور زمینیں ایسی استعمال کی ہیں جن میں خواہ مخواہ موسیقیت ہے اور جب اس کے ساتھ فقروں کا توازن بھی موجود ہو تو کیفیت اور

اور بھی دو بالا ہو جاتی ہے - میر تقی میر کے انداز بیان میں ہم نے کافی تشریح سے کام لیا ہے، یہاں چند اور مثالوں کا اضافہ کرتے ہیں ؎

میں اک دم چین سے رستے میں اُس بُت کے کہاں بیٹھا — کبھی اُٹھ کر یہاں بیٹھا، کبھی اُٹھ کر وہاں بیٹھا

ترے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا — کبھی اِس سے بات کرنا، کبھی اُس سے مات کرنا

اپنی تو اس چمن میں عمر اس طرح سے گزری — یاں آشیاں بنایا، واں آشیاں بنایا

اے مصحفی کھول آنکھیں پیری میں تغافل سے — وہ صبح ہوئی پیدا، وہ وقتِ سحر آیا

ساقی شراب لایا، مطرب رباب لایا — مجھ پر تو اک قیامت عہدِ شباب لایا

تیروں پہ تیر کھا کر زخموں پہ زخم کھا کر — اس کی گلی سے آئے ہم خون میں نہا کر

دیکھا جو اس کو غش کہا اب کیا مرے دل کو خبر — ساقی کجا، مے کس طرف، مجلس کدھر، جاناں کہاں

نہ نسیم نامہ بر ہو، نہ صبا پیام بر ہو — مجھے کس طرح سے یارب مرے حال کی خبر ہو،

کس ناز کا آنا ہے، کس قہر کا جانا ہے — قربان ترے آنے کے صدقے ترے جانے کے

وعدے کی شب جو کل تھی، کیا بیقرار تھے ہم — سو بار گھر سے نکلے، سو بار گھر میں آئے

قتل ہے مرغوب اس کو، مجھ کو جینا شاق ہے — میں اِدھر مشتاق ہوں، قاتل اُدھر مشتاق ہے

قضا نے مقتلِ عشاق کے نقشے میں ہر جا پر — وہاں سر بھی بنایا ہے جہاں شمشیر رکھی ہے

دل پیچ زلف سے ہو کیونکر رہا کسی کا — گر دام ہے تو یہ ہے زنجیر ہے تو یہ ہے

ابرو کے آگے مجھ کو لازم ہے سر جھکانا — محراب ہے تو یہ ہے شمشیر ہے تو یہ ہے

نزاکت عاشق و معشوق کی یکساں نہیں ہوتی — مری گفتار نازک ہے تری رفتار نازک ہے

نکھرا ہوا کیا چہرہ اُس آئینہ رو کا ہے — شعلہ ہے شرارہ ہے آتش ہے بھبوکا ہے

کبھو تک کے در کو کھڑے رہے کبھی آہ بھر کے چلے گئے — ترے کوچے میں جو ہم آئے بھی، تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے

نہ انیس ہے نہ جلیس ہے نہ رفیق ہے نہ شفیق ہے — ہم اکیلے گھر میں پڑے رہے، سبھی لوگ گھر کے چلے گئے

کروں موئے زلف کا کیا بیاں یہ عجیب قصہ ہے درمیاں — یہ اِدھر کو سینے پہ آ رہی، وہ اُدھر کمر کے چلے گئے

محاورہ بندی میں مصحفی مرحوم کو خاص امتیاز حاصل ہے میں نے متعدد مرتبہ ان کے کلام پر نگاہ ڈالی ہے اور اس کثرت مطالعہ کے بعد یہ خیال میرے صفحۂ دل پر نقش ہو گیا ہے کہ مصحفی مرحوم نے اپنے عہد کا کوئی فصیح محاورہ نہیں چھوڑا جسے مناسب محل پر استعمال نہ کیا ہو بلکہ بعض بعض محاورات تو اس قدر حسن و خوبصورتی کے ساتھ کام میں لائے گئے ہیں کہ ان کا محل استعمال اس سے زیادہ اچھا خیال میں نہیں آسکتا۔ محاورات کا جس قدر ذخیرہ کلام مصحفی سے دستیاب ہو سکتا ہے میرا دعوے ہے کہ اردو زبان کے کسی قدیم و جدید شاعر کے یہاں سے دستیاب نہیں ہو سکتا آزاد نے بھی جن کو شیخ مرحوم سے دلی کاوش تھی اور جو شیخ کی ہر صفت شاعرانہ کو عیب کر کے دکھانے میں کہیں نہیں چوکتے تھے اپنی تصنیف میں مجبوراً اس امر کو تسلیم کر لیا ہے کہ ہر حالت میں اصل محاورے کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے اور یہ ان کے کمالِ فن کی ایسی تصدیق ہے جسکی تکذیب کا کوئی پہلو باقی نہیں رہتا۔ چند خاص مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

اول تو مجھے خط میں سنائی ہیں ہزاروں — آخر میں یہ لکھا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

رہا کر اب تو اسیرِ قفس کو اے صیاد — کلی چٹکنے لگی رنگ پر گلاب آیا

دھویا نہ گیا خون مرا تیغ سے اس کی — کمبخت پہ پانی جو پڑا اور بھی چمکا

یہ بھی نیا جنوں ہے کہ کانٹوں سے چھوٹ کر — روئے ہم آبلے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر

یہ اس کے حسن کی نیرنگیاں ہیں — تکلف برطرف کیا حسن کیا عشق،
بھاڑ میں جائے پڑے چولھے میں کیا کام مجھے — ہو نہیں سکتی ہے اب مجھ سے تو غمخواری دل،
ہماری طرف آپ کم دیکھتے ہیں، — وہ آنکھیں نہیں اب جو ہم دیکھتے ہیں،
نہ بیٹھو ابھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر — کمان ہاتھ میں لو نشانے بہت ہیں

کیوں نہ چھاتی سے میں لگا رکھوں — داغ سینے کے مجھ کو پیارے ہیں
مصحفی آنسوؤں پر اتنا ناز — ایسے کیا عرش کے یہ تارے ہیں
لایا کبھی نہ رو بہ شفا عشق کا مرض — سو صورتیں اگرچہ اس آزار کی پھریں
فلک کی خبر کب ہے ان شاعروں کو — یونہی گھر میں بیٹھے ہوا باندھتے ہیں
میں مرگیا، ٹلی مری چھاتی کی سل کہیں — پیوند ہو زمیں کا الٰہی یہ دل کہیں
خوار رکھتا ہے اب تلک ہم کو — دیکھ سکتا نہیں فلک ہم کو
آنکھ ان کو نہیں شناخت کہاں — لوگ کچھ سمجھے ہیں، خدا ہے کچھ
لیلیٰ کی جستجو میں ہے کتنا تباہ قیس — صحرا میں اس جوان کی مٹی خراب ہے
غم میں تیرے راحت و آرام سے جاتے رہے — کھل گئے ایسے کہ ہم ہر کام سے جاتے رہے
تب ڈبویا ہے قہرِ خالق نے — جب گناہوں سے ناؤ بھر لی ہے
میرا گناہ کیا ہے جو مجھ بے گناہ پر — عالم سمٹ کے آیا ہے دعوائے خلق ہے
کس سے ہم اپنے دیدۂ تر کا کریں گلہ — ڈوبے یہ آپ اور ہمیں بھی ڈبو گئے
لیلیٰ کو شامِ غربتِ مجنوں نے آلیا — محمل گراں ہوا، قدمِ ناقہ تھک گئے
راہ لے دیر کی گر وسعتِ مشرب چاہے — کہ ترا دل بھی اے کعبہ نشیں پتھر ہے
اور کچھ مطلب نہیں ہاں رہ گئی ہے اتنی بات — راہ میں اس سے کبھی صاحب سلامت ہوگئی
رکھ کے ہم زانو پہ جس وقت کہ سر بیٹھ گئے — یہ سمجھ لیجیو کہ ہمسایوں کے گھر بیٹھ گئے
پتھر میں بن گیا ستمِ روزگار سے — ٹوٹے گا آبلہ نہ مرا نوکِ خار سے
لازم ہے تیغ اے ستم آرا لہو پئے — اس میں کمی کرے تو ہمارا لہو پیے
قطرے تری پیشانی پہ ہیں سیرِ چمن میں — ڈرتا ہوں نہ پھولوں پہ کہیں اوس نہ پڑ جائے

کیا مندرجۂ بالا محاورات آپ اپنی نظیر نہیں ہیں؟ اور کیا اس قدر مثالوں کے بعد یہ تسلیم کر لینے میں کوئی عذر باقی رہ جاتا ہے کہ محاورات فصیح کے استعمال کرنے میں مصحفی مرحوم یگانۂ روزگار تھے؟

صرف لطفِ زبان سے بات پیدا کرنا داغ کے کلام کی امتیاز خصوصیت مانی جاتی ہے لیکن ذرا شیخ مصحفی مرحوم کے دو چار اشعار بھی سن لیجئے ؎

گلی سے یار کی قاصد مرا شتاب آیا — جواب صاف ملا خط کا یہ جواب آیا
کیونکر نتیجہ نیک ہو ردِ سوال کا — یہ انفعال ان کو مرے انفعال کا
اس قدر قتل میں میرے تجھے جلدی کیا ہے — ٹھہر اے بت! میں ذرا نام خدا کا لیلوں

فلک کی خو نہیں ایسوں کی پرورش ورنہ — شکستہ حال فقیر و غریب ہم بھی ہیں

نقش شیریں میں ترے حسن کی پرواز کہاں — یہ نزاکت، یہ ادا، اور یہ انداز کہاں

تیغ ہے خنجر ہے دشنہ ہے چھری ہے تیر ہے — کچھ تو بھجواؤ تسلی کو دلِ غمناک کی

کارواں دور گیا، پاؤں تھکے، جی ہارا — کون اب منزلِ مقصود کو پہونچائے مجھے

وہ مصحفی کی قبر کو رستے میں دیکھ کر — لوگوں سے پوچھتا ہے کہ یہ کس کا مزار ہے

گیا میں اس کی مجلس میں تو وہ دربان سے یوں بولا — یہ مجلس ہے کہ میلا جو چلا آتا ہے ہر کوئی

زلفیں جو منہ میں لیں تو کہا مار کھائے گا — چومیں بھویں تو بولے کہ تلوار کھائے گا

ہے گرفتاری دل باعثِ بیماریِ دل — ہوں نہ بیمار اگر ہو نہ گرفتاریِ دل

گلی میں اس کی میں جا کر رہا تو غیرتِ عشق — یہ بولی، اُٹھ ترے رہنے کا یہ مقام نہیں

تیکھا پن بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

کہتے ہو ایک آدھ کی ہے میرے ہاتھ موت — ہم بھی سمجھتے ہیں یہ سناتے ہو ہم کو کیا

فتنے سے کہہ رہی ہے تری شوخیِ خرام — میں سیر کو چلوں مرا دامن سنبھال لو

یہ مجھ سے کیا کہا کہ پئے قتل سر جھکا — خنجر تو آپ پہلے کمر سے نکالئے،

نیند غفلت کی تمھیں آتی ہے کیونکر دیکھیں — ایک شب ہم بھی سنائیں گے فسانہ اپنا

کر دل کی ذرا سیر کہ ہے سیر اسی میں — کعبے کی اسی میں ہے بنا دیر اسی میں

مجھ کو کیا کام کہ اس کوچے میں جاؤں لے دل — تو گرفتار ہے کچھ میں تو گرفتار نہیں

سنسان دشت میں مجھے لے چل نہ اے جنوں — ظلِ درخت، سایۂ دیوار کچھ تو ہو

دل نہ سمجھو کہ فرشتوں نے جلانے کے لئے — رکھ دیا ہے مرے پہلو میں اک انگارے کو

مجھ سے کہتا ہے کہ گلیوں میں لئے پھر ہر دم — دل کمبخت کوئی تیرا خریدار بھی ہے

بھٹکتی پھرتی ہے لیلیٰ سوار ناقے پر، — جدھر ہے وادیِ مجنوں اُدھر نہیں آتی

قاصد تم کاہے کو بھیجو گے مرے پاس — نامہ تو وہ لکھے کہ جسے یاد ہو کوئی

نرگس تری آنکھوں کو بہت دیکھ رہی ہے — ہو جائے نگاہوں میں مکافات ذرا سی

بندش کی چستی اور ترکیبوں کی درستی چھپنے والی چیز نہیں مضامین حد سے زیادہ بلند ہوں یا نہ ہوں لیکن مصحفی مرحوم کے ہر شعر کا اندازِ بیان، الفاظ کی نشست اور جملوں کا ڈھال اس قدر دلکش ہے کہ تیر کی طرح دل میں گھر کر لیتا ہے۔ آزاد کی کوتاہ بینی کی طرف نہ دیکھئے جنکو کلام مصحفی کے مصفا آئینہ میں اپنی ہی کدورت کا عکس نظر آتا ہے بلکہ غیر متعصب محققین کے اقوال سے استدلال کیجئے بار بار کوشش کرتا ہوں کہ اپنے دعا کو ثابت کرنے کے لئے کم سے کم اشعار سے کام لوں۔ لیکن پھر شعر کی کشش بزبانِ حال پکارتی ہے کہ خبردار مجھے نہ چھوڑنا میں گلستانِ سخن کا اچھوتا پھول ہوں ؎

بحرِ جہاں میں آمد و شد جلد جلد ہو — مانند قطرہ جا تو برنگِ حباب آ

ہم جو تنہائی میں فریاد کیا کرتے ہیں — وصل کی شب کے مزے یاد کیا کرتے ہیں

کام کر جاتی ہیں تری آنکھیں، — چپکے چپکے ہزار آنکھوں میں،

دل جانتا ہے خوب نہ ہوگا کوئی اثر — فریاد بھی بلند ہے دستِ دعا کے ساتھ

سینے میں داب داب کے رکھوں کہاں تلک — دل ہاتھ کے تلے، جگر انگشت کے تلے

دلِ بیتاب مرا کوئی گھڑی ہے شاید — خود بخود چوٹ لگی خود بخود آواز آئی

اے دل تلاشِ یار میں پھرتا ہے تو عبث — خواہش عبث، امید عبث، آرزو عبث

منظور کب تھا کعبہ و بتخانہ دیکھنا — دونوں جگہ تھا جلوۂ جانانہ دیکھنا

چمن ہے دیدۂ خونبار سے سُرخ — بہارِ لالہ ہے داغِ جگر تک

ساتھ لیجائے کہاں عشق کی رسوائی کو — گور بھی تنگ ملی ہے ترے سودائی کو

کیا قہر ہے کہ ان کو سکھاتا ہے ناز حسن — تم چال وہ چلو کہ کسی کا چلن نہ ہو

جتنی اُلفت زیادہ ہوتی ہے — دل کی حسرت زیادہ ہوتی ہے

او سروِ رواں ذرا ادھر دیکھ — جی جاتے ہیں تیری چال کے ساتھ

اُٹھتے ہی ترے شورِ قیامت بھی گیا بیٹھ — او فتنۂ برخاستہ از بہرِ خدا بیٹھ

جاؤں میں کر کے یاس مرا آشنا ہے کون — دنیا میں بے وفا ہیں سبھی باوفا ہے کون

لے کے خنجر جو کیا چاک جگر اُس نے مرا — ٹکڑے الماس کے دو چار جگر سے نکلے

واحسرتا نصیب نے چونکا دیا ہمیں — آئی نظر جو خواب میں صورت وصال کی

سوزن کا ہے نہ کام، نہ ناخن کی ہے جگہ — کیونکر مژہ کی پھانسی جگر سے نکالئے

زبان کی پاکیزگی اور بیان کی صفائی نے شیخ مصحفی کے کلام میں جو اثر و درد جمع کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مرحوم کے بہت سے اشعار اپنی دل آویزی کی وجہ سے زبان زد خاص و عام ہیں، اہلِ درد بغیر اس کے علم کے کہ یہ شعر کس کا ہے پڑھتے ہیں اور سر دھنتے ہیں اور یہ اس حالت میں ہے کہ میر تقی میر، مومن خاں یا مرزا غالب کی طرح مصحفی مرحوم کا کوئی حقیقی پرستار موجود نہیں۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:-

شیخ کعبہ سے اُٹھ نکل باہر — گھر میں بیٹھے خدا نہیں ملتا

شوق سے گرمیٔ عارض وہ دکھائیں مجھ کو — موم کا تو میں نہیں ہوں کہ پگھل جاؤں گا

کام کر جاتی ہیں تری آنکھیں — چپکے چپکے ہزار آنکھوں میں

میں وہ نہیں ہوں کہ اس سے دل مرا پھر جائے — پھروں میں اس سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جائے

غم کھاتا ہوں جتنا مری نیت نہیں بھرتی — کیا غم ہے مزے کا کہ طبیعت نہیں بھرتی

صبح سے شام ہوئی شام سے پھر رات ہوئی — یہی وعدے ہیں تو کب ان سے ملاقات ہوئی

اجل لگائے ہوئے تاک ہر کسی پر ہے — بہوش باش کہ عالم روا روی پر ہے

پھٹ گیا جب سے گریباں تب سے — ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں

اے فلک آپ کو اتنا جو پھرایا تو نے — کوئی معشوق بھی عاشق سے ملایا تو نے

شاہد رہیو تو اے شبِ ہجر — جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی

لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے — کون سے شہر میں ہوتا ہے، کدھر ہوتا ہے

ترا شوق دیدار پیدا ہوا ہے — پھر اس دل کو آزار پیدا ہوا ہے

بلبل کے مشتِ پر بھی اُڑا دو تو سیر ہے — غنچوں کو چٹکیوں میں تو آخر اُڑا چلے

نہ کہیں صبح ہوتی ہے نہ خواب آتا ہے — رات کیا آتی ہے اک سر پہ عذاب آتا ہے

جو ملا اس نے بے وفائی کی — کچھ عجب رنگ ہے زمانے کا

عاشق سے بھی ہوتا ہے کہیں صبر رخصتی — وہ کام بتاتے ہو جو آتا نہیں ہم کو

زندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائینگے دن — فصلِ گل جیتوں کو پھر اگلے برس آئی ہے

چل چل کے جو رہ جاتا ہے ہر بار گلے پر — یہ ناز نہ ہم سے ترے خنجر کے اٹھیں گے

شکل امید تو کب ہم کو نظر آتی ہے — صورتِ یاس بھی بن بن کے بگڑ جاتی ہے

حسرت پر اس مسافرِ بیکس کی روئیے — جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

بلبل نے آشیانہ جب اپنا اٹھا لیا — پھر اس چمن میں بوم بسے یا ہما بسے

مصحفی اور داغ کے کلام میں معنوی حیثیت سے جو فرق ہے اسے میں ظاہر کر چکا ہوں لیکن اب چند اشعار تقابل کی صورت سے بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ مصحفی مرحوم کا ایک شعر ہے ؎

اول تو مجھے خط میں سنائی ہیں ہزاروں — آخر میں یہ لکھا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

مرزا داغ اس شعر اس طرح قبضہ کرتے ہیں ؎

خط میں مجھے اول تو سنائی ہیں ہزاروں — آخر یہی لکھتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

مصحفی مرحوم کا شعر ہے ؎

اب نہ فریاد ہے نہ مجنوں ہے — رہ گیا عاشقوں کا افسانہ

مرزا داغ چند الفاظ غیر ضروری اضافہ کر کے یوں کہتے ہیں ؎

باقی جہاں میں قیس نہ فرہاد رہ گیا — افسانہ عاشقوں کا فقط یاد رہ گیا

مصحفی مرحوم کا شعر ہے ؎

وعدے کی شب جو کل تھی کیا بیقرار تھے ہم — سو بار گھر سے نکلے سو بار گھر میں آئے

اور مرزا داغ اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

شبِ وعدہ : ہوا ایک جگہ مجھ کو قرار — صبح تک میں کبھی گھر میں کبھی باہر آیا

شعر اول کی بے ساختگی اور طرز ادا خصوصیت کے ساتھ دلکش ہے۔ دوسرے شعر میں یہ بات پیدا نہ ہو سکی۔

مصحفی مرحوم کا ایک بانکا شعر ہے ؎

جادۂ شمشیر تھا یا کوئے یار — پاؤں کے رکھتے ہی یہاں سر گیا

مرزا داغ کے یہاں یہ شعر اس طرح ادا ہوا ہے ؎

گلی میں یار کی جانا ہے جان سے جانا — جو پاؤں رکھتے ہیں وہ تن پہ سر نہیں رکھتے

دوسرے مصرعوں کا تقابل پورے شعر کے تقابل کے لئے کسوٹی ہے۔

مصحفی مرحوم کا ایک خاص شعر ہے ؎

اس طرف ہم ہوں گے رخصت اس طرف تم جائیو — کاٹ لے اے شمع اک شب گریہ و زاری میں اور

مرزا داغ اس طرح فرماتے ہیں ؎

اے شمع ہمارا ساتھ دینا — تکلیف ہے اور دو پہر کی

دونوں کا فرق اظہر من الشمس ہے۔

مصحفی مرحوم کا ایک اور شعر ہے ؎

بیٹھ کر وہ جہاں سے اُٹھتا ہے ایک فتنہ وہاں سے اُٹھتا ہے

مرزا داغ کہتے ہیں ؎

فتنہ ان کے قدم سے اُٹھتا ہے ہر قدم کس ستم سے اُٹھتا ہے

شیخ مصحفی کا شعر ہے ؎

حیراں ہوں اس قدر کہ شبِ وصل بھی مجھے تو سامنے ہے اور ترا انتظار ہے

مرزا داغ نے یہ حیرانی ان الفاظ میں ظاہر کی ہے ؎

اس بت پہ احتمال ہے تصویر کا مجھے عادت گئی نہ وصل میں بھی انتظار کی

فرق بیان کا محتاج نہیں۔

مصحفی مرحوم کہتے ہیں ؎

مقصود ہے آنکھوں سے ترے رخ کا نظارہ جب تو ہی نہ ہو پاس تو کس کام کی آنکھیں

اب مرزا داغ کی تشریح دیکھئے ؎

مدعا یہ تھا کہ ہم دیکھیں تجھے ورنہ کیوں نورِ نظر پیدا کیا

کیا دونوں شعروں میں بلحاظ ادا کوئی بھی نسبت ہے؟

شیخ مصحفی کا ایک خالص عاشقانہ شعر ہے ؎

کیا ادا ہے کہ اسے عکس سے اپنے ہے حیا آرسی آنکھ سے دیکھے ہے وہ شرمائے ہے

اور مرزا داغ کہتے ہیں ؎

اپنا ہی عکس کیوں نہ ہو اللہ رے حجاب دیکھا نہ آئینہ کبھی اس نے قریب سے

مصحفی فرماتے ہیں ؎

صفائے دل میں بھی کیا کیا نظر نہیں آتا جو دیکھو جام جہاں بیں سے کم یہ جام نہیں

مرزا داغ کے یہاں بھی یہ جام موجود ہے ؎

گر ذوقِ سیر ہے کچھ، تو دیکھ میرے دل کو یہ بھی ہے اک نمونہ، جامِ جہاں نما کا

اپنے اور غیر کے دل کے دیکھنے میں جو فرق ہے وہی فرق مصحفی مرحوم اور مرزا داغ کے شعروں میں سمجھنا چاہئے۔

مصحفی مرحوم کا ایک بے نظیر شعر ہے ؎

لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے کون سے شہر میں ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے

مرزا داغ نے اس سے بھی کام لیا ہے ؎

سنتے ہیں خوشی بھی ہے زمانے میں کوئی چیز ہم ڈھونڈھتے پھرتے ہیں کدھر ہے یہ کہاں ہے

مصحفی مرحوم کا شعر ہے ؎

دو چار قدم جا کے پھر آتے ہیں ہمیشہ رہتا ہے نیا روز سفر اس کی گلی میں

لیکن مرزا داغ کی بازگشت کا نقشہ یہ ہے ؎

تری گلی میں رہی بازگشت مثلِ نفس — کہ جتنی دور گیا پھر کے اتنی دور آیا

مصحفی مرحوم فرماتے ہیں :-

منھ پہ کہدیتا ہے یہ بزم میں سب کا بدونیک — ہے یہی عیب کہ آئینہ صفا مشرب ہے

مرزا داغ کی صفائی دیکھئے ؎

آئنہ منھ پہ بُرا اور بھلا کہتا ہے — سچ ہے یہ، صاف جو کہتا ہے صفا ہوتا ہے

مصحفی مرحوم دنیائے جذبات میں ایک بے مثال جذبات کھینچ گئے ہیں ؎

تصور میں تری رفتار کے ہر موج دریا کا — تماشا دیکھتا ہوں میں لبِ آبِ رواں بیٹھا

مرزا داغ نے بھی اس موقع سے فایدہ اُٹھایا ہے ؎

یاد آجاتی ہے وہ چینِ جبیں دیکھے موج — لہر سی دل میں ہمارے لبِ جو آتی ہے

تشبیہ کامل کا حق جیسا مصحفی مرحوم کے یہاں ادا ہوا ہے مرزا داغ کے یہاں نظر نہیں آتا۔

مصحفی مرحوم فرماتے ہیں ؎

جو دیکھے گل کو مرے اور نہ دیکھے تو ہو نڈھال — ہر اک طرح سے مصیبت ہے جانِ بلبل کو

مرزا داغ کے یہاں مضمون اس طرح ادا ہوا ہے ؎

ہجر ہے آفتِ جاں، وصل بلائے دل ہے — آدمی کے لئے ہر طرح غرض مشکل ہے

مصحفی مرحوم فرماتے ہیں ؎

کم نصیبی کا گلا ہے کہ ہم اس دم پہونچے — گر کے جب ہاتھ سے ساقی کے سبو ٹوٹ گیا

مرزا داغ اپنی کم نصیبی کو یوں ظاہر کرتے ہیں ؎

کم نصیبی اس کو کہتے ہیں کہ میرے وار پر، — دستِ ساقی سے ادھر شیشہ اُدھر ساغر گرا

مصحفی مرحوم کا شعر نہایت صاف و برجستہ ہے۔

مرزا داغ کے دواوین میں متعدد غزلیں ان زمینوں میں ہیں جن میں شیخ مصحفی مرحوم کو طبع آزمائی کا موقع ملا ہے اور شیخ مرحوم کے کلام میں سیکڑوں اشعار ان قوافی میں ہیں جن کو مرزا داغ کی صفائی پسند طبیعت نے اپنے لئے انتخاب کیا ہے یہاں اتنا موقع نہیں کہ ایک ایک شعر درج کیا جاسکے۔ اس لئے ہم چند خاص اشعار تحریر کرتے ہیں جو اربابِ فہم کی نگاہِ فیصلہ طلب کے لئے کافی ہوں گے ؎

گر میرے بتِ ہوش رُبا کو نہیں دیکھا	اس دیکھنے والے نے خدا کو نہیں دیکھا	داغ
یوں میں نے بُتِ ماہ لقا کو نہیں دیکھا	جس طرح کہ بندہ نے خدا کو نہیں دیکھا	مصحفی
افسوس کہ فرصت میں کبھی غور سے تم نے	افسانۂ اربابِ وفا کو نہیں دیکھا،	
ہم نام ہی سنتے ہیں فقط مہر و وفا کا	آنکھوں سے کہیں مہر و وفا کو نہیں دیکھا	
صدقے میں تم نے چھوڑ دئے ہیں بہت اسیر	میں بھی رہا ہوا کہ گرفتار ہی رہا	
مانندِ مرغِ قبلہ نما مرغِ دل مرا	نکلا نہ آشیاں سے گرفتار ہی رہا	
جلوے کے بعد وصل کی خواہش ضرور تھی	وہ کیا رہا جو عاشقِ دیدار ہی رہا	
ملنے سے میرے یار کو انکار ہی رہا	جب تک جیا میں وعدۂ دیدار ہی رہا	
زاہد مزا تو جب ہے عذاب و ثواب کا	دوزخ میں بادہ کش نہ ہوں جنت میں تو نہ ہو	

تیری ہی ذات سے تو ہے دربستہ یہ طلسم — ہستی کہاں ہماری اگر ہم میں تو نہ ہو

دستِ دعا کو ملتی ہے تاثیر عرش سے — جو ہاتھ سے ہو پاؤں سے ہو وہ جستجو نہ ہو

سرگشتہ میری طرح جو رہتا ہے آسمان — ڈر ہے مجھے اسے بھی تری جستجو نہ ہو

ملجائیں آسمان و زمیں کوئے غیر میں — بن جائے ہر ستارہ درِ گوشِ نقشِ پا

ہے کاروانِ رفتہ فراموشِ نقشِ پا — بانگِ جرس کو سن نہ سکے گوشِ نقشِ پا

تم شوخیوں سے پاؤں تو رکھو زمین پر — کھل کھیلتے ہیں اب لبِ خاموشِ نقشِ پا

افتادگانِ وادیِ غربت کی سرگزشت — کرتا ہے خود بیاں لبِ خاموشِ نقشِ پا

روندی نہیں ہے آپ نے کیا قبرِ داغ کی — پھولوں کی چادروں سے چھپا جوشِ نقشِ پا

روندن میں ہم تو ہو گئے پامالِ مصحفی — از بس کہ اس گلی میں ہوا جوشِ نقشِ پا

اُڑایا جیسے تو نے چٹکیوں میں اسکو اے قاتل — یہ زخمِ دل بھی ہنس کر منہ چڑھاتا ہی نمکداں کا

نہ ہم مرہم سے کچھ واقف نہ پھاہے کو سمجھتے ہیں — ہمارے زخم پر احسان ہے تیرے نمکداں کا

فلک نے خوب خدمت لی ہمارے دیدۂ تر سے — کہ ہر آنسو سے منہ دھویا شبِ یکبارِ ہجراں کا

اگر اس زلف کا مذکور بھی کچھ درمیاں آتا — فسانہ طول کھینچے گا بہت شبہائے ہجراں کا

ہمارے داغِ عصیاں داغ کیا کیا رنگ لائینگے — گماں گزریگا دوزخ پر بھی جنت کے گلستاں کا

نوائے بلبلانِ قدس کا میں سننے والا ہوں — خوش آتا ہے مجھے کب زمزمہ مرغِ گلستاں کا

ناوکِ یار سے یہ دل نے کہا مجھ کو چھوڑ — سائے کے ساتھ ترے میں بھی نکل جاؤں گا

دم بیمار ہوں کیا میرا بھروسہ ہے مسیح — جب کڑی مجھ پہ پڑے گی میں نکل جاؤں گا

دل لگاتا نہ کبھی دارِ فنا میں ہرگز — کیا خبر تھی مجھے آج آؤں گا کل جاؤں گا

مجھ کو قاصد کے تغافل نے تو مارا ہے ہے — روز ظالم یہی کہتا ہے کہ کل جاؤں گا

اس قدر ناز ہے کیوں آپ کو یکتائی کا — دوسرا نام ہے وہ بھی مری تنہائی کا

ہے یہاں کس کو دماغ انجمن آرائی کا — اپنے رہنے کو مکاں چاہیے تنہائی کا

ہو گیا پرتوِ رخسار سے کچھ اور ہی رنگ — میں نے منہ چوم لیا اس کے تماشائی کا

کیا تماشا ہے جو آتا ہے ترے کوچے میں — قدم آگے نہیں بڑھتا ہے تماشائی کا

تھم گئے جم گئے آنکھوں میں لہو کے قطرے — خون ظاہر ہے مرے صبر و شکیبائی کا

رہزنِ قافلۂ دل ہوئیں جب وہ آنکھیں — پہلے اسباب لٹا صبر و شکیبائی کا

سخت جانوں کا تو مشکل سے گلا کٹتا ہے — پہلے پتھر پہ لگا لیجئے خنجر اپنا،

خونِ بسمل سے ہے اس ساعدِ رنگیں پہ بہار — تم نے گو پھینک دیا ہاتھ سے خنجر اپنا

توبہ جو میں نے کی نکل آیا ذرا سا منہ — وہ رنگ روپ ہی نہیں صبح بہار کا

دیکھو شبیہہ عاشق و معشوق کا ورق — گویا مقابلہ ہے خزاں و بہار کا

عاشق کی مشتِ خاک پریشاں نہ ہو کبھی — اس میں جو میل ہو ترے دل کے غبار کا

کرے صبا طواف ہمارے مزار کا — پائے گی پھر نشاں بھی نہ مشتِ غبار کا

گر تو نہ ہو تو پھر کسی کافر کا دل لگے — دوزخ میں آرمیدہ ارم سے رمیدہ ہوں
ہستی سے اپنی مجھ کو نہیں مطلق آگہی — عمرِ گزشتہ ہوں کہ میں ہوشِ رمیدہ ہوں

نازک مزاجیوں نے مجھے تجھ سا کر دیا — اے بے خبر میں اپنے سے آپ ہی کشیدہ ہوں
مرغانِ باغ میں ترے نالے کا شور ہے — ہر چند میں ابھی نفسِ ناکشیدہ ہوں

اللہ رے کشاکشِ دیر و حرم کہ میں — ظالم ہزار ہاتھ سے دامن دریدہ ہوں
پیدا ہے میری وضع سے اک شورشِ جنوں — دریا نہیں، میں سیلِ گریباں دریدہ ہوں

سوائے جور و جفا ماورائے بغض و دغا — بتوں کے واسطے دنیا میں کوئی کام نہیں
دل ایک قطرۂ خوں، کوہِ عشق بارِ گراں — تحمل اس کا کرے آدمی کا کام نہیں

وہ جدھر کو گئے اُٹھا یہ شور — وہ قیامت اُٹھائے جاتا ہے
مجھ کو پامال کر گیا ہے ابھی — یہ جو دامن اُٹھائے جاتا ہے

جنبش میں یوں ہے وہ لبِ نازک نفس کے ساتھ — جیسے ہلے نسیم سے پتی گلاب کی
صورتِ عرق میں یوں ہے رخِ بے حجاب کی — بھیگی ہو جیسے اوس میں پتی گلاب کی

لوگ جانیں گے تصور ان کا نہیں اس کا ہے — حشر میں آپ دئے جاتے ہیں دشنام مجھے
سادگی دیکھ کہ بوسے کی ہوس رکھتا ہوں — جن لبوں سے کہ میسر نہیں دشنام مجھے

تجھ سے تو ستمگر ترے ارمان ہیں اچھے — تو جا کے نہ آیا کبھی یہ عمر بھر آئے
خواہاں ہے یہ دل، آرزوئے زخمِ دگر کا — جو زخم لگے دل پہ وہ جلدی سے بھر آئے

آخر میں دونوں باکمالوں کی دو سالم غزلیں نقل کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

مرزا داغ

یوں چلے راہِ شوق میں جیسے ہوا چلے — ہم بیٹھ بیٹھ کر جو چلے بھی تو کیا چلے
بیٹھے اُداس، اُٹھے پریشاں، خفا چلے — پوچھے جو کوئی آپ سے کیا آئے کیا چلے
آئیں گی ٹوٹ ٹوٹ کے قاصد یہ آفتیں — غافل اِدھر اُدھر بھی ذرا دیکھتا چلے
ہم ساتھ ہو لئے تو کہا اس نے غیر سے — آتا ہے کون اس سے کہو یہ جدا چلے
بالیں سے میری آج وہ یہ کہہ کے اُٹھ گئے — اس پر دوا چلے نہ کسی کی دعا چلے
موسیٰ کی طرح راہ میں پوچھے نہ راہ راست — خاموش خضر ساتھ ہمارے چلا چلے
افسانۂ رقیب بھی تو بے اثر ہوا، — بگڑے جو سچ کہے سے وہاں جھوٹ کیا چلے
رکھا دل و دماغ کو تو روک تھام کر — اس عمرِ بے وفا پہ مرا زور کیا چلے

بیٹھا ہے اعتکاف میں کیا داغ روزہ دار
اے کاش مے کدے کو یہ مردِ خدا چلے

مصحفی مرحوم

جس دم وہ میری خاک کو ٹھوکر لگا چلے، چوکے بہت وہاں سے نہ دامن ہٹا چلے
لیلےٰ بھی سیر باغ کو ہوتی نہیں سوار ناقے کے آگے آگے نہ جب تک صبا چلے
بلبل کے مشتِ پر بھی اُڑا دو تو سیر ہے غنچوں کو چٹکیوں میں تو آخر اُڑا چلے
اُٹھنے لگے وہ جب مری بالیں سے وقتِ نزع نکلا یہی زباں سے آہستہ کیا چلے
کیا تھا خزاں میں باغ میں آنے سے ہمکو کام آئے تھے آشیانے کو ہم کو جلا چلے
یارب یہ مصحفی کی دعا ہے کہ آج کل مشرق سے ایک بار کچھ ایسی ہوا چلے

جو خود بخود سپہر پہ چڑھ مثلِ آفتاب
مغرب زمیں کو تختِ سلیماں چلا چلے

"نگار" کے پچھلے فایل

(یہ تمام فایل اکٹھا فروخت ہوں گے)

سنہ ۲۶ء = ——— مئی تا اکتوبر ——— ۷ے
سنہ ۲۷ء = ——— جون تا نومبر ——— ۷ے
سنہ ۲۸ء = ——— جنوری تا دسمبر ——— ۱۲ع۵ر
سنہ ۳۰ء = ——— جنوری تا دسمبر ——— ۱۲ع۵ر
سنہ ۳۱ء = ——— جنوری تا دسمبر ——— ۱۲ع۵ر
سنہ ۳۲ء = ——— جنوری تا دسمبر ——— ۱۲ع۵ر
سنہ ۳۳ء = ——— جنوری تا جون ——— ۷ے
سنہ ۳۴ء = ——— جنوری تا دسمبر ——— ۱۲ع۵ر
سنہ ۳۵ء = ——— جنوری تا دسمبر ——— ۱۲ع۵ر
سنہ ۳۶ء = ——— جنوری تا دسمبر ——— ۱۲ع۵ر
سنہ ۳۷ء = ——— جنوری تا جون ——— ۷ے
سنہ ۴۵ء = ——— جولائی تا اکتوبر ——— ۴ للعہ
سنہ ۴۶ء = ——— جنوری تا نومبر ——— ۱۱ع۵ر
سنہ ۴۸ء = ——— جنوری تا جون ——— ۷ے
سنہ ۳۳ء = ——— جولائی، اگست، ستمبر، نومبر، دسمبر ۵ر
سنہ ۳۸ء = ——— جنوری تا جون ——— ۷ے

منیجر نگار لکھنؤ

رعایتی اعلان

من ویزداں ——— مذہبی استفسارات وجوابات ——— نگارستان
۸ر ۸ر للعہ
جمالستان ——— مکتوبات نیاز تین حصے ——— مذہب
۸ر ع۱۲ر ۱ر
ماہ و اعلیہ ——— حسن کی عیاریاں ——— شہاب کی سرگزشت
۲ر ۲ر ۲ر
مجموعہ استفسار و جواب جلد سوم ——— قولِ فیصل ———
۳ے ۲ر
فراست الید ——— نقاب اُٹھ جانے کے بعد ———
۱ر ۸ر

میزان
ع۵۲ء

یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول
صرف پینتالیس روپے میں مل سکتی ہیں

منیجر نگار لکھنؤ

۱۸۵۷ء اور اُردو شعراء

(گزشتہ سے پیوستہ)

(گوپی چند نارنگ)

صہبائی غدر کے وقت کوچۂ چیلیاں میں رہتے تھے۔ انگریزوں کے غلبہ کے بعد اس کوچہ پر جو مصیبت نازل ہوئی، صہبائی بھی اس کی زد میں آئے اور اس کوچہ کے کئی دوسرے باشندوں کی طرح بالکل بے گناہ و بے قصور مارے گئے۔ منشی ذکاء اللہ[1] اس قتل عام کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ نواب شمشیر جنگ خاں کے بیٹے محمد علی یا حکیم فتح اللہ نے کسی انگریز سپاہی کو جو ان کے زنانہ مکان میں برے ارادہ سے جانا چاہتا تھا، زخمی کر دیا اس کی خبر جب انگریزی کمان افسر کو ہوئی تو اس نے حکم دیا کہ اس کوچہ کے تمام مردوں کو زندہ گرفتار کر کے لاؤ یا قتل کر دو۔ اس حکم کی بڑی بے دردی سے تعمیل کی گئی۔ سپاہی گھروں میں گھس گئے کچھ مردوں کو تو وہیں مار ڈالا اور اکثر کو گرفتار کر کے حاکم کے سامنے لے گئے[2]، جس نے حکم دیا کہ ان سب کو دریا کے کنارے لیجاؤ اور گولی مار دو۔

ان لوگوں کو رسّی سے باندھ کر دریا کی ریتی میں ایک قطار میں کھڑا کیا گیا اور گولیوں کی باڑھ ان پر چھوڑی گئی۔ جس سے سب مر کر گر گئے، اس قتل عام سے جو دو آدمی زندہ بچے تھے، اُن میں سے ایک مرزا صہبائی کے داماد اور بھانجے وزیرالدین تھے یہ بعد میں کانپور میں جج کے سرشتہ دار ہو گئے۔ علامہ راشد الخیری نے ان کا نام میر قادر علی لکھا ہے اور ان کی زبانی اس واقعہ کی تفصیل یوں نقل کی ہے:-

"میں صبح کی نماز اپنے ماموں جان (مولانا صہبائی) کے ساتھ کٹرہ مہر پور کی مسجد میں پڑھ رہا تھا کہ گورے دن دن کرتے آپہونچے۔ پہلی ہی رکعت تھی۔ امام کے صافے سے ہماری مشکیں کس لی گئیں۔ شہر کی حالت نہایت خطرناک تھی اور دلّی حشر کا میدان بنی ہوئی تھی۔ مخبروں نے ہماری بابت بغاوت کی اطلاعیں سرکار میں دے دیں اس لئے ہم سب گرفتار کر کے دریا (جمنا) کے کنارے لائے گئے۔ ایک مسلمان افسر نے چپکے سے ہم سے آکر کہا کہ موت تمہارے سر پر ہے اور گولیاں تمہارے سامنے ہیں۔ دریا تمہاری پشت پر ہے، اب بچاؤ کی صرف یہی شکل ہے کہ تم میں سے جو تیرنا جانتے ہوں وہ بلا تامل دریا میں کود پڑیں۔ میں بہت اچھا تیراک تھا مگر ماموں جان (مولانا صہبائی) اور ان کے صاحبزادے مولانا سوز تیرنا نہ جانتے تھے۔ اس لئے میرے دل نے گوارا نہ کیا کہ ان کو چھوڑ کر اپنی جان بچاؤں۔ لیکن ماموں جان نے مجھے اشارہ کیا۔ اس لئے میں دریا میں کود پڑا ابھی پچاس ساٹھ گز پانی میں گیا ہوں گا کہ دنا دن گولیوں کی آواز میرے کان میں آئی، پلٹ کر دیکھا تو سب گر کر مر گئے تھے"۔

خواجہ حسن نظامی کا بیان ہے کہ اس حادثہ میں صہبائی کے کنبہ کے ۲۱ افراد بے گناہ[2] قتل ہوئے[3]۔ آزردہ کا شعر ہے:-

کیونکر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو[4]

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ، مولوی ذکاء اللہ، دہلی ۱۹۰۴ء (صفحہ ۷۰۲) نیز ملاحظہ ہو داستان غدر ظہیر دہلوی، لاہور، (ص ۱۲۸) اور روزنامچہ معین الدین حسن خاں (غدر کی شام) مرتبہ حسن نظامی، دہلی ۱۹۲۵ء (ص ۸۷)۔ [2] دہلی کی آخری بہار، راشد الخیری ص ۷۸، ۷۹۔ [3] دہلی کی جاں کنی، حسن نظامی، دہلی ۱۹۲۲ء (ص ۲۵)۔ [4] فغان دہلی (قلمی)، مرتبہ فضل حسین کوکب، مخطوطہ لٹن لائبریری، علی گڑھ۔ [5] بحوالہ دہلی کالج میگزین (دہلی کالج نمبر) شذرات۔

سفینہ رحمانی میں ان کی شہادت سے متعلق یہ درد انگیز فارسی مرثیہ ملتا ہے :-

ندانم کجا رفت آں نعشِ پاک — ملک بود با ماند بر روئے خاک
ندانم کسے دار او را کہن، — ویا ماند چوں سایہ بر خاک تن
ندانم چہ کرد است با او سپہر، — زجامہ کفن کرد یا تاب مہر
بخاکش نمودند اورا نہاں — ویا مرتفع شد سوئے آسماں
کسے فاتحہ ہم بروخواندہ است — بعطر گلابی بر افشاندہ است
کدامی گل و بلبل و باد دشت — بخاکش بحسنِ عقیدت گزشت
الٰہی بیا مرز مظلوم را — کلاہ شہی دہ بہ ملکِ بقا

بفردوسِ اعلیٰ بود جائے او
بہشتِ بریں باد ماوائے او[1]

مفتی صدرالدین آزردہ "غدر" کے وقت دہلی کے صدر الصدور تھے۔ غدر کے دنوں میں انھیں بادشاہ کی طرف سے حکم ملا تھا کہ "اس وقت تک فوجی مقدمات کی سماعت کریں جب تک انگریزوں پر فتح حاصل ہو"[2] روزنامچہ جیون لال سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ غدر کے دوران میں آزردہ اکثر شریکِ دربار ہوتے تھے۔ ایک موقع پر بادشاہ نے انھیں اپنے چند ایسے اشعار بھی سنائے جن میں انگریزوں کی مذمت اور دیسی سپاہ کی حوصلہ افزائی کی گئی تھی[3]

جنرل بخت خاں نے جولائی میں دہلی پہونچ کر بڑی ہوشیاری اور سلیقہ مندی سے علمائے دین سے جہاد کا فتویٰ جاری کرایا تھا۔ اس پر دستخط کرنے والوں میں آزردہ بھی شامل تھے۔ چنانچہ شکست دہلی کے بعد ان پر بھی انگریزوں کا عتاب نازل ہوا اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح یہ بھی گرفتار ہوئے۔ یہ شعر اسی زمانہ کی یادگار ہے :-

آ پھنسے بے ڈھب الٰہی دیکھئے کیسے بنے — رہ گئے سب الٰہی دیکھئے کیسے بنے

انگریزوں نے ان پر فتویٰ جاری کرنے اور باغیوں کی اعانت کرنے کا الزام لگایا۔ نواب علام حسن محو اپنے رسالہ "نصرت نامہ گورنمنٹ" میں لکھتے ہیں[4] کہ آزردہ نے پیروی مقدمہ میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ میں نے فتویٰ پر دستخط تو کئے لیکن اس کے نیچے "کتبت بالجبر" بھی لکھدیا ہے۔ عدالت نے اس بات کی تصدیق کی اور انھیں بری کر دیا۔

آزردہ کی رہائی سے متعلق یہ واقعہ بعد میں کئی جگہ دہرایا گیا ہے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی اس کی تاویل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں دستخطوں کے نیچے "کتبت بالخیر" لکھ دینے کا عام رواج تھا۔ آزردہ نے "بالخیر" پر نقطہ لگائے۔ علمائے وقت نے اسے "بالخیر" پڑھا لیکن آزردہ نے اسے "بالجبر" بتایا اور جان چھڑائی[5]

طرفہ لطیفہ ہے کہ خود فتویٰ سے اس واقعہ کی تصدیق نہیں ہوتی۔ یہ فتویٰ اخبار المظفر دہلی میں شایع ہوا تھا۔ وہاں سے اس کی نقل انہی دنوں میں "صادق اخبار دہلی" مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء میں چھپی تھی۔ یہ اخبار نیشنل آرکائیوز میں محفوظ ہے اور اس فتوے کے عکس "سوتنتر دہلی" (ہندی) اور "نوائے آزادی" میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ فتوے پر دستخط کرنے والوں میں آزردہ کا نام تو ملتا ہے لیکن اس کے آگے پیچھے "کتبت بالجبر" وغیرہ کوئی عبارت ہی نہیں۔ غرض اس روایت کا حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔

---

[1] بحوالہ دہلی کالج میگزین، (دہلی کالج نمبر) شذرات۔ [2] غدر کی صبح شام، صفحہ ۱۸۸۔ [3] ایضاً ص ۱۹۰ — [4] غدر کا نتیجہ مرتبہ حسن نظامی، دہلی ۱۹۲۵ء، ص ۱۲۹ — [5] غدر کے علماء (ذکر آزردہ)

ابھی حال میں جناب استیاز علی عرشی نے اپنے ایک مضمون میں اس فتوے کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا ہے[1]۔ یہ فتوے دراصل جبراً حاصل کیا گیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ اہلِ علم انگریزوں کے خلاف جنگ کو مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ ان ہی نے یہ فتویٰ مرتب کیا اور اپنی رضامندی سے اس پر دستخط بھی کئے لیکن بقیہ سے اس کی توثیق مجبوراً کرائی گئی چنانچہ ممکن ہے کہ شکست کے بعد جب باز پرس ہوئی تو آزردہ نے بھی جبر کی پناہ لی اور اپنی مجبوری کا اظہار کیا ہو۔

لیکن فوجی عدالت کا انھیں اپنی مجبوری کے اظہار پر رہا کر دینا محلِ نظر ہے۔ اس سلسلہ میں مولوی ذکاء اللہ کا یہ بیان اہمیت سے خالی نہیں کہ آزردہ نے زرِ کثیر دیکر جاں بخشی کی سند حاصل کی[2]۔ خواجہ حسن نظامی نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں بڑے بڑے امیروں کو جاں بخشی کی سندیں ناظر خواہ روپیہ لے کر دی جاتی تھیں۔ آزردہ کے علاوہ نواب حامد علی خاں اور مکند لال مصر نے بھی اسی طرح پرائیویٹ ایجنسی کے ذریعہ زرِ کثیر دے کر جانیں بچائی تھیں[3]۔

بہرحال آزردہ قید کی مصیبت سے تو بچ گئے لیکن مال و جایداد، مکانات اور جاگیر سب بحق سرکار ضبط ہو گئے۔ ہزاروں روپیہ کا کتب خانہ پہلے لٹ چکا تھا، چنانچہ آزردہ نہایت خستہ و تباہ حال ہو کر لاہور آئے یہاں اپیل کی جس سے بمشکل تمام نصف جایداد بحال ہوئی۔ بعد میں اس سے بھی صرف ۴۰ روپے ماہانہ آمدنی ہوتی تھی۔ آزردہ چونکہ امام بخش کی اولاد کے بھی کفیل تھے، آخری ایام بڑی عسرت میں گزرے۔ مال و جایداد کی ضبطی اور عزت و آبرو کی بربادی نے زندگی کے باقی حصہ کو تلخ بنا دیا تھا[4]۔ اس کا کچھ اندازہ اس شہر آشوب سے ہوتا ہے جو فغانِ دہلی میں شامل ہے[5]۔ آزردہ نے غمِ دوراں کی تلخی اور تندی کے سارے نشتر میرٹھ کے کالوں پر ختم کر دئے ہیں اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دہلی میں شامت اہلِ قلعہ کی بدولت آئی۔ انھوں نے اپنی خانہ ویرانی اور بے سروسامانی کا ذکر دہلی کے باثر اور باعزت طبقے کے درد و غم کی داستان کے طور پر کیا ہے جس سے درد انگیزی کی کیفیت بہت بڑھ گئی ہے۔ دہلی کی گزشتہ پرنشاط زندگی اور موجودہ پریشانی اور ابتری کا یہ مرقع اتنا موثر ہے کہ اس کے دیکھنے سے آج بھی رقت طاری ہوتی ہے :-

زیور الماس کا سب جن سے نہ پہنا جاتا — بھاری جھومر بھی کبھی سر پہ نہ رکھا جاتا
گاج کا جن سے دوپٹہ نہ سنبھالا جاتا — لاکھ حکمت سے اُڑھاتے تو نہ اوڑھا جاتا
سر پہ وہ بوجھ لئے چار طرف پھرتے ہیں
دو قدم چلتے ہیں مشکل سے تو پھر گرتے ہیں
طبع جو گہنے سے پھولوں کے اذیت پاتی — مہندی ہاتھوں میں لگا سوتے تو کیا گھبراتی
صبح سے شام تلک نیند نہ آن کو آتی — ایک سلوٹ بھی بچھونے میں اگر پڑ جاتی
ان کو تکیہ کے بھی قابل نہ خدا نے رکھا
سنگ پہلو سے اُٹھایا تو سرہانے رکھا
جن کو بن دوش پرستار نہ چلتے دیکھا — صبح سے شام تلک عطر ہی ملتے دیکھا
کبھو بیدار نہ سورج کے نکلتے دیکھا — پاؤں دابے پہ بھی کروٹ نہ بدلتے دیکھا
وہ ہیں اور دشت ہیں اور کوہ ہیں اور نالے ہیں
قدم اُٹھتا نہیں پاؤں میں پڑے چھالے ہیں

---

[1] مولانا فضل حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتویٰ جہاد، ماہنامہ تحریک، اگست ۱۹۵۷ء — [2] تاریخ عروج انگلشیہ (ص ۱۲۷) - [3] دہلی کی جاں کنی (ص ۱۵)
[4] آزردہ کے آخری ایام کی دردناکی تفصیل، مرزا غالب نے حکیم سید احمد حسن کو ایک خط میں لکھی ہے ملاحظہ ہو اُردوئے معلّٰی، طبع لاہور ص ۱۸۰ - [5] فغان دہلی، مطبع رضوی دہلی ص ۱۱

آخری بند میں اپنے بعض احباب کا بڑا پرسوز ذکر کیا ہے :-

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے — سر پہ ہے اور جوشِ جنوں، سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر جی ہی پہ بن جاتی ہے — مصطفٰے خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیونکہ آزردہ نکل جائے : سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

مصطفٰے خاں شیفتہ نے انگریزوں سے نفرت اپنے استاد مومن سے ورثہ میں لی تھی۔ مفتی انتظام اللہ شہابی کا بیان ہے کہ :-

"۱۸۵۷ء کی انقلابی تحریک رونما ہوتے ہی شیفتہ بھی اپنے ہم رشتہ نوابوں اور رئیسوں کے ساتھ انگریزوں کے مخالف اور بہادر شاہ کے ہم نوا بن گئے۔ اس وقت رؤسا میں سب سے بڑی شخصیت ولی داد خاں رئیس بالاگڑھ کی تھی ان کے پرچم کے تلے غلام حیدر خاں زمیندار پونڈری، مہدی بخش سہارنپوری، قاضی وزیر علی بلند شہری، عبداللطیف خاں رئیس خان پور، اسمٰعیل خاں، اعظم خاں، نواب مصطفٰے خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد وغیرہ جمع تھے۔ ولی داد خاں مذکور کی بھانجی بادشاہ دہلی کے ایک شہزادے سے بھی منسوب تھی، شیفتہ کے متعلق بادشاہ سے خط و کتابت کرنا تفویض تھی چنانچہ ہنگامہ ہونے پر ولی داد خاں نے اپنے علاقہ میں بڑی سرگرمی دکھائی مگر پانسہ اُلٹا پڑا۔ بعد تسلط ہر ایک باغی قرار دیا گیا۔ کسی کو حبسِ دوام ہوا۔ کوئی، برس کے لئے قید ہوا، شیفتہ کو بھی، برس کی قید فرنگ ہوئی"[1]

یہ بیان مشکوک اور محلِ نظر ہے۔ شیفتہ کا غدر میں باغیوں کی حمایت کرنا ثابت نہیں۔ مالک رام صاحب لکھتے ہیں :-

"چونکہ جہانگیر آباد غیر محفوظ تھا یہ (شیفتہ) احتیاطاً وہاں سے اُٹھ کر اپنے دوست عبداللطیف خاں رئیس خان پور کے یہاں آن مقیم ہوئے۔ ٹھاکروں نے موقع دیکھ کر جہانگیر آباد لوٹ لیا اور ان کے محلوں کو نذرِ آتش کر دیا جس میں دوسرے اثاث البیت کے ساتھ ان کا قیمتی کتب خانہ بھی جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ بارے رام پور کی فوج جو تلنگوں کی گوشمالی کے لئے دہلی جا رہی تھی، یہاں سے گزری اور ان کی مدد سے ٹھاکروں کو بے دخل کیا گیا اور جہانگیر آباد پر نواب مصطفٰے خاں کا دوبارہ قبضہ ہوا۔ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد ان پر مقدمہ قایم ہوا کہ تم نے اپنی جاگیر یوں غیر محفوظ چھوڑ کر گویا باغیوں کی اعانت مجرمانہ کی تھی، جاگیر ضبط ہو گئی اور ابتدائی عدالت نے سات برس قید کی سزا دی، بارے اپیل میں بری ہو گئے"[2]

شیفتہ کی قید و بند کا ذکر کرتے ہوئے غالب نے حکیم غلام نجف خاں کو ایک خط میں لکھا ہے :-

"مصطفٰے خاں کا حال سنا ہوگا۔ خدا کرے مرافعہ میں چھوٹ جائے ورنہ حبس ہفت سالہ کی تاب اس نازپروردہ میں کہاں"[3]

شیفتہ کو جب اس مصیبت سے نجات ملی تو غالب اپنی بے دست و پائی کے باوجود "بمجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر" ۲۱ جنوری ۱۸۵۹ء کو میرٹھ گئے، شیفتہ سے ملے اور ۲۴ جنوری تک وہیں رہے[4]

جاگیر واگزاشت ہونے کے بعد شیفتہ دہلی چھوڑ کر جہانگیر آباد جا رہے لیکن وطن کی یاد ہمیشہ ستاتی رہی :

ویرانے کے مانند کہیں دل نہیں لگتا
ہر چند کہ ہے شیفتہ دلی وطن اپنا

دہلی مرحوم سے متعلق انھوں نے ۱۳ شعر کا ایک مرثیہ بھی لکھا۔ کوکب نے فغانِ دہلی میں اسے نقل کیا ہے۔ یہ مرثیہ ان کے مطبوعہ کلام میں شامل نہیں۔ دہلی کے انقلاب کا اثر شیفتہ کے دل پر ہوا، اس کا کچھ اندازہ اس مرثیہ کے ان اشعار سے ہوگا۔

---

[1] غدر کے علماء، انتظام اللہ شہابی، دہلی (ص ۵۵) — [2] تلامذہ غالب، مالک رام (اُردو ادب ج ۲ شمارہ ۱، ص ۱۳۴)
[3] اُردوئے معلی، طبع لاہور، ص ۱۶۸۔ [4] از خط بنام میر مہدی مجروح، خطوط غالب، ج ۱، ص ۳۰۵۔

ہائے دہلی وزہے دل شدگان دہلی، آپ جنت میں ہیں اور دل نگرانِ دہلی
وہی جلوہ نظر آتا ہے تصور میں ہمیں مٹ گئے پر بھی یہ باقی ہے نشانِ دہلی
تھیں جو انہار بہشتی کی حکایت نہریں وہی نہریں ہوئیں اب اشک روانِ دہلی
گر نہ کہویں کہ یہ دلّی ہے، تو ہرگز نہ پڑے دلّی والوں کو بھی دلّی پہ گمانِ دہلی
صورتیں ہوگئیں معنی جسد ارواح ہوئے بے خبر کہتے ہیں ویراں ہے جہانِ دہلی

غزل طرحی ہے - پتہ نہیں چلا کہ یہ غزل سالک نے مشاعرے کے لئے کہی یا بعد میں کہکر کوکب کے حوالے کردی - اس کا ایک شعر ہے :-

غالب و نیرو ثاقب سے بنا ہے گویا بلی ماروں کا محلہ صفاہانِ دہلی

قطعہ میں دہلی کی تباہی اور قتل عام کی بڑی پر لطف شاعرانہ توجیہ کی ہے - اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سالک بھی اپنے استاد غالب کی طرح اپنے زخموں پر زیر لب مسکرانے کا حوصلہ رکھتے تھے :-

قطعہ

شہر دہلی ہوا ہے کیوں خالی، کیوں مٹی ہیں سے صورت آدم
روز بازار موت دیکھ کے چین ملک الموت کو نہیں ایک دم
ڈھیر کس جا نہیں ہے مردوں کا کس زباں پر نہیں فغاں پیہم
نہیں تل دھرنے کی زمیں میں جگہ مردے کا دفن ہو بلا سے اہم
خاک آسودگانِ پیشیں پر یہ نئے طور کا ہوا ہے ستم
ایک کی قبر میں گئے سو اور تنگیِ جا سے لڑتے ہیں باہم
قافلہ قافلہ گئے کیوں لوگ کب ہے اتنا وسیع ملکِ عدم
نہیں جاتے مگر عدم کو یہ لوگ اور ہی نکتہ اس میں ہے مبہم
کرۂ خاک و باد و آتش و آب فرط خلقت سے ہوگئے تھے کم
روئے اپنی کمی پہ یہ چاروں ہوگیا رحم خالقِ عالم،
دے دئے ان کو لے کے خلقت سے کچھ عناصر جو مل رہے تھے بہم

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں میر مہدی حسین مجروح (وفات ۱۹۰۵ء) کو بھی بڑی مصیبتوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا - یہ گھر بار چھوڑ کر در در کی ٹھوکریں کھاتے، پانی پت پہونچے اور یہیں کچھ عرصہ محلۂ انصار میں رہے - اس دوران میں وہ دہلی کے حالات جاننے کے لئے بڑے بیتاب رہتے تھے - غالب کے خطوط سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ان کے بار بار پوچھنے پر انھیں "ان کی دلّی کی باتیں" لکھ بھیجا کرتے تھے - یہی وجہ ہے کہ غالب کے ہاں دہلی کی تباہی اور بربادی کے بارے میں جتنی مفصل معلومات مجروح کے نام کے خطوں میں ملتی ہیں[1] دوسرے خطوں میں نہیں ملتی - انہی باتوں میں غالب نے بعض جگہ بڑے بلیغ اشارے کئے ہیں مثال کے طور پر ایک خط میں مجروح کی اردو عبارت کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"سنو، دلّی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گنتی ہے - یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی سو ایک ظالم پانی پتی انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا"[2]

---

[1] ملاحظہ ہو خطوط غالب، جلد اول، خطوط بنام میر مہدی مجروح، ص ۲۹۲، ۳۰۰، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۷، ۳۱۲، ۳۲۰، ۳۲۲، ۳۲۲ اور ۳۵۱ - [2] خطوط غالب ج ۱ - ص ۳۱۱ -

اس میں ایک لطیف طنز یہ ہے کہ فتحِ دہلی کے بعد دہلی کے لوگوں کو قتل کرنے اور لوٹنے مارنے میں پنجاب کے دیسی سپاہی سب سے پیش پیش تھے۔ ایک دفعہ مجروح نے غالب کو اپنے آشوبِ چشم کی اطلاع کی، مجروح کو دہلی سے گہری محبت تو تھی ہی، غالب نے شوخی طبع سے کام لیتے ہوئے لکھا:-

"تمھاری آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دلّی میں ڈھائے گئے اور جہاں سڑکیں نکلیں، جتنی گرد اُڑی اس کو آپ نے ازراہ محبت آنکھوں میں جگہ دی"[1]

غدر کے پرآشوب زمانہ میں غالب نے ایک فارسی روزنامچہ دستنبو لکھنا شروع کیا تھا۔ مجروح کو اس کی عبارت سے لطف اندوز ہونے کا یا شاید دہلی کے حالات جاننے کا اتنا اشتیاق تھا کہ غالب اپنے روزنامچہ میں جو کچھ لکھتے جاتے ساتھ کے ساتھ اس کی نقل ان کو بھی بھیج دیتے تھے[2]۔ دہلی میں ابھی پوری طرح امن قایم نہیں ہوا تھا کہ مجروح نے دہلی آنا چاہا۔ غالب نے انھیں محتاط کرتے ہوئے لکھا کہ دہلی میں آج کل آنا بے لطف ہے، مسلمان تو بلا ٹکٹ شہر میں داخل ہی نہیں ہو سکتا۔[3] اس پر بھی جب مجروح کا شوقِ دید کم نہ ہوا تو غالب نے انھیں دسمبر ۱۸۵۹ء میں دق ہو کر لکھا:-

"تم آتے ہو تو چلے آؤ نثار خاں کے چھتے کی سڑک، خان چند کے کوچہ کی سڑک دیکھ جاؤ، بلاقی بیگم کے کوچہ کا ڈھنا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز میدان نکلنا سُن جاؤ"[4]

غالب کے ایک خط مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۸۶۲ء سے ظاہر[5] ہے کہ اس دوران میں مجروح دہلی آئے اور یہاں سے چلے بھی گئے۔ دہلی میں قیام کے دنوں میں انھوں نے غالباً یہاں اس مشاعرے میں شرکت بھی کی جس کی غزلیں کوکب نے مرتب کی ہیں۔ فغانِ دہلی میں مجروح کی سات اشعار کی غزل درج ملتی ہے، دو شعر ملاحظہ ہوں:-

یہ کہاں جلوۂ جاں بخشش بتانِ دہلی — کیونکہ جنت پہ کیا جائے گمانِ دہلی
ان کا بے وجہ نہیں لوٹ کے ہونا برباد — ڈھونڈھے ہیں اپنے مکینوں کو مکانِ دہلی[6]

غدر کے دنوں میں قربان علی بیگ سالک (وفات ۱۸۸۱ء) کو بھی سب مال و متاع چھوڑ کر شہر سے نکلنا پڑا۔ ٹھوکریں کھاتے اور پھونچے۔ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد ان کا دہلی واپس آنا ثابت نہیں۔ لیکن دشت غربت میں بھی وطن کی یاد برابر ستایا کی۔ دہلی کی بربادی سے متاثر ہو کر انھوں نے ایک ترکیب بند، ایک غزل اور ایک قطعہ لکھا ہے۔ ترکیب بند میں ۱۹ بند ہیں۔ آپ بیتی بیان کی ہے۔ اس لئے ہر بند درد و داغ اور سوز و غم کا مرقع ہے۔ دہلی کی بربادی سے متعلق دوسرے شہر آشوبوں کی طرح اس کا آغاز بھی دہلی مرحوم کی گزشتہ رونق اور چہل پہل کے ذکر سے ہوا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب جہان آباد، جہان بھر کے شہروں میں خاص وقعت و وقار رکھتا تھا۔ جانے اسے کس کی نظر بد کھا گئی کہ اس کی عظمت اور شان و شوکت کا محل دیکھتے دیکھتے مسمار ہو گیا۔ شاعر تہذیب و تمدن کے اس کھنڈر پر آنسو بہاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جامع مسجد کی ویرانی الگ دل تڑپاتی ہے۔ جہاں کبھی صف ملائکہ نماز گزار ہوتی تھی وہ اب جگہ تصویر خاموشی بنی ہوئی ہے۔ نہ نماز ہے نہ اذان کی صدا۔ اردگرد کے بازاروں کی ہما ہمی اور چہل پہل سرد پڑ گئی۔ ہر طرف گل و خشت اور چوب و سنگ کے ڈھیر پڑے ہیں اور در و دیوار سے وحشت اور افسردگی برستی ہے۔ سالک نے انگریزی سپاہ کے ظلم و ستم اور دہلی کے عوام و خواص کے ذلیل و خوار اور بے جرم قتل ہونے کا نقشہ بھی دکھایا ہے۔ ایک بند میں اہلِ دہلی کے خراب و خوار ہو کر گھروں سے نکلنے اور راہوں میں چور اچکوں یا گوجروں کے ہاتھ سے لٹنے کا رونا بھی رویا ہے۔ اس افراتفری اور نفسا نفسی میں پردہ نشینوں پر جو قیامت گزری، اس کا ذکر اور بھی اندوہناک ہے۔ چند بند پیش کئے جاتے ہیں:-

---

[1] خطوط غالب جلد ۱ صفحہ ۳۲۹
[2] اردو، صفحہ ۱۴۱
[3] خطوط غالب، جلد اول، صفحہ ۲۹۲
[4] خطوط غالب، صفحہ ۳۲۳
[5] خطوط غالب صفحہ ۳۴۷
[6] انقلاب دہلی، مرتبہ نظامی بدایونی ص ۹۸
[7] خم خانۂ جاوید، ج ۴، ۳۷

جہاں میں شہر تھے جتنے جہاں جہاں آباد — بس اُن بلاد میں تھا منتخب جہان آباد
اُجڑ کے یاں سے نہ پوچھو ہوا کہاں آباد — گیا عدم کو دوبارہ ہوا وہاں آباد
فلک نے کس سے کہوں کیوں اُٹھا لیا اس کو
ارم کا قصر سمجھ کر اُٹھا لیا اس کو

سمجھ کے اپنا ٹھکانا گئے جہاں ہم لوگ — ذلیل یاں سے زیادہ ہوئے وہاں ہم لوگ
بنے ہیں طائرِ گم گشتہ آشیاں ہم لوگ — پھرے ہیں امن کے طالب کہاں کہاں ہم لوگ
زمین ہوگئی دشمن نہ پائی جائے ثبات
ٹھہر سکا نہ کسی جائے اپنا پائے ثبات

لکھوں میں پردہ نشینوں کا حال کیا ہے ہے — بیان مجھ سے ہو کیونکر یہ ماجرا ہے ہے
نہ آئی جن کی کبھی در تلک صدا ہے ہے — نکل کے گھر سے چلیں وہ پیادہ پا ہے ہے
کبھی نہ غصہ میں بھی جامے سے جو باہر ہوں
غضب ہے یہ کہ وہ بے پردہ اور چادر ہوں

ہجوم مسجد جامع کا کیا کروں اظہار — صفِ ملائکہ ہوتی جہاں نماز گزار
ہر ایک صف میں نہ رہتا مصلّیوں کا شمار — اب اس کو دور سے بھی دیکھنا ہوا دشوار
نماز ہے نہ اذاں ہے نہ کوئی جاتا ہے
جب اس کو دیکھئے خالی، تو جی بھی آتا ہے

وہ اس کے گرد کے بازار اور وہ زینت — ہجوم خلق سے ہر روز ایک نئی صورت
کہ جس کے دیکھنے سے طبع کو ہو اک فرحت — یہاں سے جائے کبھی میلہ میں تو ہو نفرت
الٰہی کیا ہوئے اجناس رنگا رنگ کے ڈھیر
پڑے ہوئے ہیں گلِ خشت و چوب و سنگ کے ڈھیر

داغ کی عمر غدر کے وقت چھبیس برس کی تھی۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کا بیان ہے کہ ۱۸۵۷ء کے حادثہ کے وقت داغ قلعہ میں تھے، دہلی کی شکست کے وقت جب قلعہ خالی ہونے لگا تو یہ بھی بحالِ تباہ وہاں سے نکلے۔ جلدی میں ان کا بہت سا ابتدائی کلام وہیں رہ گیا جس کا ساری عمر افسوس رہا۔ بڑی مشکلیں جھیلنے کے بعد آنولہ (ضلع بریلی) پہونچے جہاں ان کے ایک دوست حکیم ولایت علی خاں رہتے تھے، کچھ دنوں یہاں رہے، پھر رام پور چلے گئے۔[1] داغ رام پور کب پہونچے، اس کا کچھ پتہ نہیں، لیکن ۲۷ اپریل ۱۸۵۸ء کو جب ظہیر دہلوی رامپور آئے تو داغ پہلے سے وہیں موجود تھے۔ اس کے کچھ مدت بعد وہ پھر دہلی لوٹ آئے۔[2]

انشائے داغ اور حکایات غالب سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۹ء اور ۱۸۶۰ء میں داغ دہلی ہی میں تھے۔ اس دوران میں دہلی کی تباہی دیکھ کر ان کے دل پر گہرا اثر ہوا دہلی اب دو سال پہلے کی دہلی نہ تھی۔ لال قلعہ کے وہ محراب و در جن کے سائے میں داغ نے ہوش سنبھالا تھا، سنسان اور برباد ہو چکے تھے اور مغلیہ تہذیب کی وہ روایتیں جنھوں نے داغ کو ذوقِ شعر گوئی اور لطفِ زبان جیسی نعمتیں بخشی تھیں، دم توڑتی ہوئی نظر آئیں ان حالات سے متاثر ہو کر داغ نے جو شہر آشوب لکھا اسے کوکب ۱۸۶۲ء میں کتاب

---

[1] نقوش (جون ۱۹۵۵ء) شمارہ ۲۲، ۲۳ (ص ۲۷۰) ... [2] فریادِ داغ، (مقدمہ) تکمین کاظمی - لاہور، ۱۹۵۰ء

فغانِ دہلی میں شامل کر چکے تھے - چنانچہ ممکن ہے کہ داغ نے یہ مسدس ۱۸۵۹ء کے دوران میں جبکہ ان کا دہلی میں موجود ہونا ثابت ہے، یہاں کے چشم دید حالات کی بنا پر لکھا ہو - اس میں واقعاتی عنصر بہت گہرا ہے - شروع کے تین بند ہنگامے سے پہلے کی دہلی کی تعریف میں ہیں اور دہلی کی سابقہ شان و شوکت اور وہاں کی تہذیبی اور تمدنی خوبیوں کا ذکر کیا ہے - چوتھے سے ساتویں بند میں میرٹھ کے سپاہیوں کے دہلی میں آنے اور دین کے نام پر جنگ و جدال کرنے کا تذکرہ ہے - داغ نے ہنگامہ کی تمام تر ذمہ داری پوربیوں کے سر ڈالی ہے اور ان کی تخریبی کارروائیوں کا مضحکہ اڑایا ہے - انگریزوں کے غلبہ کے بعد دہلی کے زن و مرد کا جیسا بے تحاشا قتل ہوا اور عوام، شرفا، علماء اور اہلِ اقتدار پر جو گزری اس کا ذکر سرسری طور پر داغ نے آخر کے ایک بند میں کیا ہے لیکن اس کے برعکس دیسی سپاہ کی اُن کارروائیوں کے تاریک پہلو کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے جو اس نے انگریزی اداروں کو ختم کرنے کے لئے کی تھیں - انگریزوں کے غلبہ کے بعد صاف گوئی تو ممکن نہیں تھی لیکن داغ کے رویہ میں اپنوں کی خدمت کا جیسا غلو ملتا ہے، اس پر کچھ نہ کچھ اثر رامپور کے تعلقات کا بھی پڑا ہے - نواب رام پور انگریزوں کے حامی تھے اور داغ غدر سے پہلے رامپور سے تعلق پیدا کر چکے تھے - قطع نظر اس کے داغ کا شہر آشوب ادبی حیثیت سے خاص امتیاز رکھتا ہے - زبان نہایت پر تاثیر ہے اور بے جا لفاظی اور لاطائل تفصیل کے بجائے رمز و ایما سے کام لیا ہے - چند بند ملاحظہ ہوں :-

ہر شہر وہ ہے کہ ہر انس و جان کا دل تھا — یہ شہر وہ ہے کہ ہر قدر دان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہندوستان کا دل تھا — یہ شہر وہ ہے کہ سارے جہان کا دل تھا

رہی نہ آدھی یہاں سنگ و خشت کی صورت
بنی ہوئی تھی جو ساری بہشت کی صورت

فلک نے قہر و غضب تاک تاک کر ڈالا — تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا
یکایک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا — غرض کہ لاکھ کا گھر اس نے خاک کر ڈالا

جلیں ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچی ہیں کانٹوں پہ جو پتیاں گلاب کی تھیں

کھلایا زہر ستمگر نے پان کے بدلے — پلایا خونِ جگر پیچوان کے بدلے
نصیب دار ہوئی ہے نشان کے بدلے — ملا نہ گور گڑھا بھی مکان کے بدلے

عداوتِ فلکِ کینہ ساز تو دیکھو
اور اس پہ اس ستم آرا کے ناز تو دیکھو

برنگ بوئے گل اہلِ چمن، چمن سے چلے — غریب چھوڑ کے اپنا وطن، وطن کو چلے
نہ پوچھو زندوں کو بیچارے کس چلن سے چلے — قیامت آئی کہ مُردے نکل کفن سے چلے

مقام امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی

پئے محاسبہ پرسش ہے نکتہ دانوں کی — تلاش بہر سیاست ہے خوش زبانوں کی
جو نوکری ہے تو اب یہ ہے نوجوانوں کی — کہ حکم عام ہے بھرتی ہے قید خانوں کی

یہ اہلِ سیف و قلم کا ہو جبکہ حال تباہ
کمال کیوں نہ پھرے در بدر کمال تباہ

چند شعر غزل کے بھی ملاحظہ ہوں :-

گرم ہنگامہ ہوئے لالہ رخانِ پنجاب — گل کھلائے ہیں نئے تو نے خزانِ دہلی
رشکِ شمشاد تھا ہر خو[illegible] قدو ہر خوش رفتار — سرو آزاد تھا ایک ایک جوانِ دہلی
دے دیا فوج کو حکام نے انعام میں سب — گنج قاروں سے فزوں گنج نہانِ دہلی
نیّر و غالب و آزردہ سے پھر لوگ کہاں — داغ اب یہ ہیں غنیمت ہمہ دانِ دہلی[1]

محمد حسین آزاد بھی انگریزوں کے زخم خوردہ تھے۔ ان کے والد مولوی محمد باقر دہلی سے دلّی اُردو اخبار نکالتے تھے انھیں انگریزوں نے غدر کے بعد گولی سے اُڑا دیا۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ :- مولوی محمد باقر کا دہلی کالج کے پرنسپل ٹیلر سے گہرا دوستانہ تھا۔ جب دہلی میں شورش شروع ہوئی تو کالج کے دوسرے انگریز استادوں کے ساتھ ٹیلر نے بھی میگزین میں پناہ لی، لیکن میگزین کے پھٹ جانے کے بعد یہ وہاں سے کالج کے احاطہ میں آئے اور اپنے بڈھے خانساماں کی کوٹھری میں گھس گئے۔ اس نے انھیں مولوی محمد باقر کے گھر پہونچا دیا۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ محمد باقر نے ایک رات تو ٹیلر کو اپنے امام باڑہ کے تہ خانے میں چھپائے رکھا لیکن جب محلہ والوں کو اس کی خبر ہوگئی تو محمد باقر نے ٹیلر کو ہندوستانی لباس پہنا کر رخصت کیا۔ یہ غریب ابھی مشکل سے بیرم خاں کی کھڑکی تک پہونچے تھے کہ لوگوں نے پہچان لیا اور لٹھ مار مار کر ہلاک کر دیا۔[2] مولانا آزاد کے پوتے آغا محمد باقر کا بیان ہے کہ ٹیلر ملنگوں کے ڈر سے مولانا محمد باقر کی مسجد میں گھس گئے تھے مگر انھوں نے انھیں وہاں سے گھسیٹ کر نکالا اور پاؤں میں رسّی باندھ کر گلیوں میں گھسیٹتے پھرے، یہاں تک کہ وہ ہلاک ہوگئے۔[3]

ہنگامہ ختم ہونے کے بعد ٹیلر کو ہلاک کرانے کی سزا میں مولوی محمد باقر کو گرفتار کیا گیا اور ان کا کوئی عذر نہ چلا، مکان لُٹ گیا اور جائداد بحق سرکار ضبط ہوگئی۔ آزاد خاندان کے ۲۲ نیم جاں افراد کو ساتھ لے کر گھر سے نکلے، ابھی دھوبی واڑہ میں تھے کہ ایک گولا پاس آکے گرا۔ آزاد کی ایک دودھ پیتی بہن دھماکے سے دہل گئی اور کئی دن بعد اسی حالت میں فوت ہوگئی۔

آزاد نے اہلِ خاندان کو سونی پت روانہ کیا اور خود اپنے والد کی خبر لینے کو شہر واپس آئے، ایک سکھ کرنیل ان کے والد کا دوست تھا اس کے ذریعہ سائیس کے لباس میں دہلی دروازے کے باہر، خونی دروازے کے سامنے والے میدان میں پہونچے۔ یہاں وہ سب لوگ موجود تھے جنھیں گولی مار دینے کا حکم تھا۔ انھیں میں ان کے والد بھی تھے جو نماز پڑھ رہے تھے۔ بعد نماز دور سے باپ نے بیٹے کو پہچانا، دیکھتے ہی ہاتھ سے اشارہ کیا کہ یہاں سے چلے جاؤ، اور دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے دو چار روز کے بعد معلوم ہوا کہ انھیں گولی مار دی گئی۔[4]

اس کے برعکس جہاں بانو بیگم نقوی نے لکھا ہے کہ گھر سے روانگی کے وقت ٹیلر نے ایک لاکھ ۵۰ ہزار کے نوٹ مولوی باقر کو دئے اور خود ان کے گھر سے نکل گیا۔ باہر نکلتے ہی مارا گیا۔ مولوی محمد باقر یہ نوٹ ہاڈسن کے پاس لے گئے اور سارا واقعہ بیان کیا۔ اس نے پورا واقعہ سنا بھی نہیں۔ صرف اتنا پوچھا "ٹیلر کہاں ہیں"، انھوں نے جواب دیا کہ ان کو تو باغیوں نے قتل کر دیا۔ اس پر فوراً ہاڈسن نے حکم دیا "گولی مار دو"، چنانچہ آن کی آن میں ان کی لاش میدان میں تڑپنے لگی۔[5]

اس واقعہ کے بعد آزاد پریشان حال دہلی سے نکلے اور لکھنؤ پہونچے یہاں ان کو اطلاع ملی ان کا وارنٹ کٹ چکا ہے، یہ گھبرائے اور مدراس کا رُخ کیا کچھ عرصہ نیل گری کے ملٹری اسکول میں استاد رہے وہاں سے بمبئی آئے۔ یہاں بھی زیادہ دن نہ رہ سکے، تو پنجاب کا رُخ کیا۔ مالوہ اور ریاست جنید میں سے ہوئے جگراؤں (ضلع لدھیانہ) پہونچے، یہاں سے سیالکوٹ اور کشمیر گئے آخر کار لاہور آئے جہاں ان کی زندگی کا باقی حصہ بسر ہوا۔

مولوی عبدالحق کا یہ بیان کہ آزاد، دہلی سے نکل کر ایران میں، بادیہ پیمائی کرتے رہے اور معافی کے بعد ہندوستان آئے، صحیح نہیں۔

---

[1] مرقع دہلی کالج، مولوی عبدالحق، ص ۱۶ - [2] نقوش (شخصیات نمبر) ص ۱۰ - [3] ایضاً ص ۱۰ - [4] محمد حسین آزاد - ص ۱۵

دراصل آزاد نے یہ وقت جنوبی ہندوستان میں بسر کیا۔ وارنٹ کا پھر کچھ پتہ نہ چلا۔ غالباً عدم پتہ کی وجہ سے داخل دفتر ہو گیا ہوگا۔

آغا محمد باقر لکھتے ہیں کہ تعلیم سے فارغ ہو کر آزاد نے اپنے والد کے پریس اور اخبار (دہلی اُردو اخبار) کو سنبھال لیا تھا اور ان کے مضامین و طرز تحریر سے یہ اخبار بے حد مقبول ہوا۔ آزاد ایسٹ انڈیا کمپنی پر بے لاگ تنقید کیا کرتے تھے اور غیر ملکی حکومت سے پرخاش رکھتے تھے غدر کے بعد دلّی اُردو اخبار کے تمام پرچے بحق سرکار ضبط کر لئے گئے، جن لوگوں کے پاس کچھ پرچے تھے، انھوں نے بھی خوف سے ضایع کر دئے، مرزا غالب نے سکے کا الزام رد کرنے کے لئے اس اخبار کے پچھلے پرچے حاصل کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن انھیں کبھی یہ نہیں ملتے تھے۔ غنیمت ہے کہ حیدر آباد (دکن) اورنٹیل آرکاویز آف انڈیا میں اس کے کچھ پرچے محفوظ ہیں۔ غدر کے دنوں کے پرچوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آزاد کمپنی کی حکومت کو سخت نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے اور باغیوں کی کامیابی سے خوش تھے۔ اس سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے اس واقعہ کی تاریخ "تاریخ عبرت افزا" کے نام سے کہی یہ تاریخ انہی ایام میں دہلی اُردو اخبار میں شایع ہوئی تھی۔ آزاد کی وطن دوستی کے سلسلہ میں نظم خاص اہمیت رکھتی ہے چونکہ یہ ان کے مطبوعہ کلام میں شامل نہیں، اس لئے یہاں اسے بجنسہ درج کیا جاتا ہے:۔

کو ملکِ سلیماں و کجا حکمِ سکندر — شاہانِ اولی العزم، سلاطینِ جہاندار
کو سطوتِ حجاج و کجا صولت چنگیز — کو خانِ ہلاکو و کجا نادرِ خونخوار،
نہ شوکت و حشمت ہے نہ وہ حکم نہ حاصل — کس جا ہے جہاں اور کہاں ہیں وہ جہاندار
کو رستم و سہراب و کجا سامِ نریمان — اس معرکہ میں کند ہے ایک ایک کی تلوار
کو حکمتِ لقمان و کجا علمِ فلاطوں — خیل حکما و علمائے اولی الابصار
ہوتا ہے ابھی کچھ سے کچھ اک چشم زدن میں — ہاں دیدۂ دل کھول مرے صاحب ابصار
ہے کل کا ابھی ذکر کہ جو قوم نصاریٰ — تھی صاحبِ اقبال و جہاں بخش و جہاندار
تھی صاحب علم و ہنر و حکمت و فطرت — تھی صاحب جاہ و حشم و لشکر جرار
اللہ ہی اللہ ہے جس وقت کہ نکلے — آفاق میں تیغِ غضبِ حضرتِ قہار
سب جوہر عقل ان کے رہے طاق پہ رکھے — سب ناخن تدبیر و خرد ہو گئے بیکار
کام آئے نہ علم و ہنر و حکمت و فطرت — پورب کے تلنگوں نے لیا سب کو یہیں مار
یہ سانحہ وہ ہے کہ نہ دیکھا نہ سنا تھا — ہے گردِ گردوں بھی عجب گردشِ دوّار
نیرنگ پہ غور اس کے جو کیجئے تو عیاں ہے — ہر شعبدۂ تازہ میں صد بازیِ عیار
ہاں دیدۂ عبرت کو ذرا کھول تو غافل — ہے بند یہاں اہلِ زباں کے لبِ گفتار
آنکھیں ہوں تو سب کھل گئی دنیا کی حقیقت — مت کیجو دلا اس کا بھروسہ کبھی زنہار
عبرت کے لئے خلق کے یہ سانحہ بس ہے — گر دیوے خدا عقل سلیم و دل ہشیار
کیا کہئے کہ دم مارنے کی جائے نہیں ہے — حیراں ہیں سب آئینہ صفت پشت بدیوار
حکام نصاریٰ کا بدیں دانش و بینش — مٹ جائے نشاں خلق میں اس طرح سے یکبار
اس واقعہ کی چاہی جو آزاد نے تاریخ — دل نے کہا "قل فاعتبروا یا اولی الابصار"[1]
۱۲۷۳ھ

(باقی)

---

[1] دلّی اُردو اخبار مورخہ ۲۹ ماہ رمضان المبارک ۱۲۷۳ھ روز یکشنبہ مطابق ۲۴ مئی ۱۸۵۷ء (نیشنل آرکائیوز آف انڈیا۔ کلکشن نمبر ۲، جلد ۱۹۸، نمبر ۲۱)

یادِ رفتگاں

ریاضؔ مرحوم کا ایک خط

(رامپور کی ادبی صحبتیں)

نیاز صاحب - آپ میری تصویر کو بڑھاپے میں روشناس خلق یا رسوائے عالم کرنا چاہتے ہیں ؎

میں پھر اس در سے تو نکلت تماشائی ہوئی آگے آگے داغ پیچھے پیچھے رسوائی ہوئی

میں خود اپنی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتا اوروں کی نسبت کیا عرض کروں وہ دن گئے ؎

دنیا کی پڑ رہی ہیں نگاہیں ریاضؔ پر کس وضع کا جوان ہے کس آن بان کا

یہ کہنے کا موقع کہاں ؎

تم جوانی کے مزے لوٹو ریاضؔ، عیب بھی زیبا ہے اس سن کے لئے

اب تو میرے لئے ہر ایک کو مجبوراً یہ کہنا پڑے گا ع

جنت میں بھی جا کے یہ جواں ہو نہیں سکتا

گو بڑھاپے کی بڑھتی ہوئی ہوں اس عمر میں بھی یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے ؎

دے پیرِ مغاں دخترِ رز عمرِ رسیدہ بوڑھا ہوں لے نورِ نظر چرخ کہن کی

وہ زمانہ بھی غنیمت تھا - جب دھوپ چھاں یا نیم سپید ریش کسی کے دست حنائی سے رنگ حنا کی خواستگار ہوتی تھی اور کسی موقع پر خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی لکھنوی سے یہ سننا پڑا تھا ؎

حنا لگائے پہونچتے ہیں گلرخوں میں ریاضؔ کچھ ان کی ریش مبارک کا اعتبار نہیں

یا خداوندِ نعمت حضور مہاراجہ صاحب بہادر بالقابہ والی محمود آباد اودھ - صورت دیکھتے ہی ارشاد فرمایا کرتے تھے ؎

بڑے نیک طینت بڑے صاف باطن ریاضؔ آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

خود بھی رنگینی خضاب کے اسباب فراہم کر کے شوقِ خضاب میں کہنا پڑتا تھا ؎

خوب ہیں شاہدانِ بازاری، ہم سیہ کار وہ خضاب فروش

دیکھئے کالا منہ کرنے کے محاورے کو کس حسن سے ادا کیا ہے - ایسے ابتذال پر غیر مبتذل صدہا شعر صدقے آپ بھی غالباً قدر کریں گے گو باعتبار ریش، گوری کالی یعنی سیاہ و سفید دونوں سے آپ بے نیاز ہیں -

کالی گوری کے مبتذل استعمال نے اس وقت ایک شعر بے محل اور ریش سے غیر متعلق یاد دلوایا - شاید آخری جوانی اور ریش آہن کردہ سے گو دور کا تعلق ہو، آپ جبین پر بل ڈال کر بادلِ ناخواستہ وہ میرا مبتذل شعر بھی سن لیجئے مگر کوشش فرمایئے گا کہ میرے قدر دان مہربان مولوی عبدالسلام صاحب ندوی مولف شعر الہند تک نہ پہونچنے پائے ؎

کالی گوری کوئی نہ چھوٹی افیوں کھا کر، پی لی - توبہ

آپ اُس زمانہ میں میری تصویر شایع کر رہے ہیں جب ریش سفید پر کوئی رنگ ہی نہیں چڑھتا نہ سادن کی مہندی کام دیتی ہے نہ کسی شوخ کے لب تازک سے شراب کی لالیاں

اب ریش سفید نے دراز عمر شیخوخیت سے زیادہ اعتبار پیدا کر لیا ہے۔

کبھی کبھی "دراں بچہ دہ خر گوشے" بھی سن لینا پڑتا ہے مگر قصر نماز کی طرح قصر ریش کی طرف طبیعت مایل نہ ہوئی۔

اس وقت ریش مبارک کے ذکر میں ایک غیر متعلق قصہ عنفوان شباب یا اس سے کچھ پہلے کا یاد آگیا اُسے بھی سن لیجئے۔ اب تو باعتبار ریش و بروت یہ کہنے کے بھی قابل نہیں ہوں ؎

قشقہ مرا شباب تھا پی لی بھیکیر جو مسیں شراب پی لی

یہ وہی زمانہ ہے کہ بغیر شراب کے مسیں بھیگ رہی تھیں۔

واقعہ یہ ہے۔ لکھنؤ میں کسی تقریب سرکاری کے ذریعہ سے کچھ والیانِ ملک بھی آئے تھے۔ داروغہ عباس علی مرحوم انجینیر و یکتائے فن فوٹوگرافر کے دولت خانہ پر جس کا اب نشان تک نہیں ہے۔ چند مقتدر نوابین و رؤسائے شہر تشریف فرما تھے۔ منشی نولکشور آنجہانی بھی موجود تھے اور میں بھی۔ کہ ایک رئیس با اختیار مع مختصر اسٹاف کے مرغِ زریں بنے آتے نظر آئے۔ اطلاع کے ساتھ ہی سب حضرات تعظیماً استقبال کے لئے بڑھے دیکھا کہ ریش دونوں جانب پائے پر چڑھی ہوئی۔ شکل مشیخین۔ چہرہ غضبناک نہ سلام میں خود سبقت کی نہ سلام کا جواب دیا۔ زبان پر لکھنؤ کا نام اور صدہا سلواتیں۔ لعنت، اور پھٹکار کی بار بار تکرار اس طرح مقام نشست تک تشریف لائے۔ اور باوصف تلخ گوئی اعزاز کے ساتھ بٹھائے گئے۔ مگر گفتار اور کردار و لہجے میں فرق نہ آیا، مزاج پرسی کی جرأت کون کر سکتا تھا۔ وہ البتہ سخنہائے درشت سے مزاج پرسی فرمائے جاتے تھے، کچھ دیر کے بعد جب زبان تالو سے لگی۔ تو ایک سن رسیدہ گرم و سرد دیدہ نواب صاحب نے بہ ادب عرض کیا۔ لکھنؤ سے برافروختگی کا سبب معلوم ہو تو ہم بھی ہم نوا ہونے کی جرأت کریں۔ فرمایا یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ اسلام شہر مگر جسے دیکھئے داڑھی صاف، مسلمان و غیر مسلمان میں امتیاز نہیں نہ مصافحہ و معانقہ کا موقع نہ سلام علیک کا۔ ساتھ ہی پھر لعنت کی تکرار۔ سلسلہ ٹوٹنے پر سن نواب صاحب نے عرض کیا۔ برافروختگی کا سبب تو معلوم ہو گیا مگر حضور نے خود سبب نہ دریافت فرمایا۔ بہ ادب عرض کرتا ہوں سنئے:۔

غدر سے پہلے میں بھی اور سب مسلمانانِ لکھنؤ بھی۔ ریش کے رکھ رکھاؤ میں آپ ہی کے مقلد تھے۔ ایک روز میں خدا بنوا رہا تھا۔ آئینے پر نظر تھی۔ اطلاع پر اطلاع مسجدوں، امام باڑوں کے منہدم کئے جانے اور بے احتیاطی برتنے کی آرہی تھی، دفعتاً یہ اطلاع ملی کہ نواب آصف الدولہ کا مشہور امام باڑہ اور اُس کی وسیع و حسین مسجد گھوڑوں کا اصطبل بنا دی گئی، نہ روک تھام کی طاقت تھی نہ انتظام کی۔ میں نے مشتعل ہو کر خاص تراش سے کہا کہ ریش رکھ کر مسلمان صورت رہوں اور یہ خبریں سنوں۔ تو اسے صاف کر دے۔ اس کے بعد ہی رئیس صاحب کی طرف ہاتھ بڑھا کر لعنت ہے اس داڑھی پر۔ پھٹکار ہے اس داڑھی پر۔ جواب میں خاموشی تھی اور سناٹا۔ وہ سین اس وقت تک خیال کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ سن نواب صاحب کے وقتی جواب سے بہتر جواب ایسے کج خلق رئیس کے لئے کیا ہو سکتا تھا۔ میں ڈر رہا ہوں سارد ایل اور مسجد و اذان کا معاملہ مسلمانوں کی ریش مبارک پر حملہ نہ کرے اور میری ریش مبارک پر بھی نہ بن جائے میں نے تو اس امید پر اسے لگا رکھا ہے کہ ع

خدا شرم دارد ز موئے سفید

ناظرینِ نگار و تصویر کو صرف میرے اشعار دیکھنا چاہئے نہ کہ مجھے ؎

کہتا تھا گلرخوں سے ریاضِ شکستہ حال مجھ کو نہ دیکھئے مرے اشعار دیکھئے

یہ سنتے ہی۔ میری تصویر یقیناً نظروں سے گر جائے گی اور مذہبی تاریک نقطۂ نظر سے۔ تصویر کھنچوانے کے جرم میں، میں بھی۔ رہے اشعار زیادہ حصہ ان کا بھی تاریک ہے۔ خدا کرے یہ بھی ناظرین کی آنکھ کا نور بنے، اور کبھی نظر سے نہ گرے۔ میں شعر صرف اپنے لئے کہتا ہوں

جو ایسا نہیں سمجھتے ان کو اپنے مذاق کے خلاف خواہ وہ مبتذل اشعار ہوں یا عریاں - موقع اور محل کے لحاظ سے ضرورتاً استعمال کرنا چاہئے ورنہ تضیع وقت اور اُن کے مبتذل عریاں مذاق کا ثبوت ع

ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مقامے دارد

ابھی عرض کر چکا ہوں ع

کالی گوری کوئی نہ چھوٹی

جو مبتذل بھی ہے عریاں بھی - مگر دوسرے مصرع نے نہ ابتذال باقی رکھا نہ عریانی - ضرب المثل کا موقع سے استعمال ہوگیا اور لغت نگاروں کے لئے سند کی دقت رفع ہوگئی - میں نے یہ مثالاً کہا نہ کہ اس خیال سے کہ میرے اشعار سند کا کام دیں گے - دوسری مثال امیر مینائی کے کلام سے پیش کرتا ہوں - ارشاد فرماتے ہیں ع سینے پر چڑھ کے جس نے کیا پیار کیا ہوا

اس سے زیادہ ابتذال اور عریانی کیا ہو سکتی ہے - یہ کمال شاعری ہے کہ مصرع اول نے ابتذال و عریانی رفع کر کے شعر کو کچھ سے کچھ بنا دیا - مصرع اول سننے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مصرع مبتذل کے لئے مصرع بہم پہونچانا ممکن تھا - نہ اب قوتِ شعری کوئی دوسرا مصرع بہم پہونچانے کے لئے کارفرما ہو سکتی ہے - اب مصرعِ اول کے ساتھ دوسرا مصرع ملاحظہ ملاحظہ فرمائیے ؎

اُترا ہوا گلے کا ترے ہار کیا ہوا سینے پہ چڑھ کے جس نے کیا پیار کیا ہوا

جناب داغ ارشاد فرماتے ہیں ؎

ایسے کو تو خدا کی قسم چھوڑنا ہے کفر مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں

یہ شعر داغ صاحب موزوں نہ فرماتے تو ضرب المثل کے لئے سند کا لمنا دقت سے خالی نہ تھا - واقعاتی اسلوب بیان ایسا ہے کہ باوصف ابتذال ادھر سنا اُدھر یاد ہوگیا - قسم شاہد پرستی کے اعتبار سے ہے یا اثر حسن و شباب کا تقاضا طبیعت پر قابو نہ رہنے کی حالت میں وہی اثر قسم کے استعمال کا حامی ہے، یہ شعر خود ہی اجازت نہیں دیتا کہ بے محل اس کو زبان پر لائے - اس کا ابتذال بے محل سنانے والے کے لئے الزامی صورت پیدا کرتا ہے نہ کہ کہنے والے کے لئے - غالب کا شعر ملاحظہ فرمائیے - جس مسلمہ صحیح مذاق سخن اور پاکیزگی زبان و قدرتِ بیان اوروں میں کم پائی جاتی ہے

ڈھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

قدرت بیان نے بے ساختہ زبان کے اتفاقی واقعات نے اس سخت قافیے کو موزوں کرنے میں شاعری کے کمالِ فن کو ظاہر کر دیا - علیٰ ہذا مستند شعرائے متقدمین متاخرین کے کلام میں ایسے ابتذال و عریانی کے اشعار بھی پائے جائیں گے -

مجھے کہنا صرف یہ تھا کہ میں شعر اپنے لئے کہتا ہوں اگر اور لوگ بھی لطف اندوز ہونے میں اپنا حق سمجھتے ہیں تو بہ اعتبار موقع و محل ان کا استعمال کریں ورنہ الزام ان کے سر - ان کی خاطر سے - اخلاقی طور پر میں اپنے سر ہی مبتذل گوئی و لغو گوئی کا الزام لے لوں گا اور آفرین کے عوض نفرین کو اپنا حصہ سمجھوں گا ؎ ریاض

تحسین ناشناس کا صائب ہے شکوہ سنج نفرین ناشناس کا ہم کیوں گلہ کریں

مجھے اس وقت دورِ حاضر کے مہذب تعلیم یافتہ شعراء کے مذاق و زبان شعری سے بحث نہیں ہے وہ صحیح ارتقائی حالت میں ہو یا اس کے برعکس - مجھ کو دورِ آخر کے مستند اساتذہ و ثقات شعراء سے ملنے اور مستفید ہونے کا اتفاق ہوا ہے - ان کے لطیف اشعار کا تو کیا ذکر ان کی ہر بات نقشِ دل ہے - میں نے ان کے مذاق شعری میں، عاشقانہ رنگ ہو - یا صوفیانہ - یہاں تک کہ سوقیانہ بھی باعتبار نوعیت کلام قریب قریب یکسانیت دیکھی گو کہنے کا جادہ جدا ہوتا تھا - اُن کی انتخابی یکسانیت نے جو متقدمین کے تتبع سے علٰحدہ نہ تھی - صحیح مذاق سخن کا معیار ہمیشہ کے لئے میرے خیال میں پیدا کر دیا ہے - موجودہ دور میں، مغربی شعری مذاق نے اختراعی تغیرات ضرور پیدا کئے - جن سے نظم و نثر دونوں میں ارتقائی شان کا خاص رنگ جھلکتا نظر آتا ہے - اب ہندی نامانوس الفاظ کی جدید آمیزش کا زیادہ بیجا حصہ اسی طرح دکنی اختراعی اصطلاحات (جو مستند اہلِ زبان

کے اتفاق رائے کے غالباً محتاج ہے) ٹکسالی اُردو پر کب تک اور کہاں تک اثر ڈالیں گے ابھی نہیں کہا جا سکتا اور وہ جگہ حاصل کرنے کے بعد دیرپا بھی ہوگا یا نہیں۔ تراجم کے خصوصیات اور اخباری زبان کی امتیاز ہمہ گیر وسعت آیندہ بہ ترقی جو صورت ٹکسالی اُردو کے لئے اختیار کرے بہ اعتبار بلندی مضامین نہ پاکیزگی تخیل ٹکسالی خصوصیات چھوڑ کر اُردو زبان بہت کچھ سرمایہ دار ہو گئی ہے خدا کرے صحیح زبان اور صحیح مذاق سے جو بیگانگی یا بے نیازی پائی جاتی ہے وہ جاتی رہے کاش انگریزی مذاق و خیالات کے تتبع حضرات ایسے اشعار موزوں کرنے کی طرف اور زیادہ توجہ کو دخل دیں جو مغربی اور ایشیائی مذاق دونوں میں اعلیٰ درجۂ قبولیت حاصل کریں۔

مجھے یاد ہے، غازی پور میں شاہ احمد اللہ مرحوم سب جج اور شاہ امجد اللہ مرحوم منصف کے دولت خانے پر چند معزز حضرات بی۔اے۔ ایم۔اے پاس تشریف فرما تھے، ایشیائی شاعری کے متعلق۔ کسی قدر بُرے پہلو کو لئے ہوئے اظہار خیالات ہو رہا تھا۔

میں نے عرض کیا۔ میر انیس مرحوم و مغفور کے نیچرل مناظر کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ میں امیر مینائی کا ایک شعر سنانا چاہتا ہوں۔ شاید وہ اس صحبت میں درجۂ قبولیت حاصل کرے اور آپ حضرات اس سے بہتر یا اس کے برابر کسی انگریزی شعر کے ترجمے سے مجھے ممنون فرمائیں۔

اجازت ملنے پر میں نے یہ شعر سنایا ؎

لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں
بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

میں نہیں کہہ سکتا سننے والوں پر کب تک وجد کی حالت طاری رہی۔ ممکن ہے یہ صورت میرے بنانے کے لئے اختیار کی گئی ہو۔ کبھی کبھی شعراء کے قلم سے ایسے شعر نکل جاتے ہیں جو مغربی مذاق سے خراج تحسین حاصل کرتے ہیں۔

تقریباً تیس سال سے زیادہ زمانہ ہوا کہ میرا ایک شعر، کسی ولایت کے اخبار میں کسی خاص وجہ سے درج ہو گیا جسے پانیر نے بھی اور سول اینڈ ملیٹری گزٹ لاہور نے بھی لیا۔ یہ اتفاق ہے کہ سول اینڈ ملیٹری گزٹ کا وہ ترجمہ خان بہادر سید ناصر علی خانصاحب حال انسپکٹر نمک مالک صلائے عام دہلی کی نظر سے گزرا۔ ممدوح نے وہ شعر اور اُس کا نوٹ تراش کر مجھے بھیجدیا اور اس کے ساتھ جو الفاظ مجھے لکھے میں اُسے مایۂ ناز سمجھا، متعدد خطوط بھی انگریزی داں حضرات کے میرے پاس آئے اور خاص الفاظ سے میری عزت افزائی کی گئی۔

بر سبیل تذکرہ وہ شعر ذیل میں درج کئے دیتا ہوں۔ ممکن ہے آپ کو بھی پسند آئے اور پسند فرمانے میں میرے لئے اخلاقی رعایت سے کام نہ لیا جائے ؎

عالم ہو میں کچھ آواز سی آجاتی ہے
چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا

میں نے آپ کا بہت وقت ضایع کیا اور ابھی کچھ اور ضایع کرنا چاہتا ہوں۔ شعری مذاق صحیح کی نسبت اوپر کچھ عرض کر چکا ہوں۔ چاہتا ہوں، تین چار شعر مذاق صحیح کے ثبوت میں پیش کروں۔

جس زمانہ میں ریاض الاخبار ہفتہ وار اور گلدستہ ریاض ماہوار خیرآباد سے شایع ہوتا تھا اور جس کے مطبع کا تاریخی نام لمعۂ رخشاں تھا۔ اعلیٰ حضور جناب نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں نے مجھے میرے استاد حضرت امیر مینائی مرحوم و مغفور کے ذریعہ سے یاد فرمایا۔ اُس وقت دربار قیصری میں تمام اخبار نویس ہر صوبے سے مدعو کئے گئے تھے۔ ان کا کیمپ خاص تھا۔ خیمے بہ کمال تزئین و تکلف نصب تھے۔ دو اڈیٹروں کے لئے ایک خیمہ ضروری فرنیچر و اسباب آرام کے ساتھ مخصوص تھا کھانے اور ناشتے کے لئے خاص سرکاری اہتمام تھا۔ پر تکلف چائے ہر وقت طیار رہتی تھی۔ چمن بندیاں اعلیٰ پیمانے پر تا حد نظر ہر طرف تھیں میں بھی اور منشی نظام اللہ مرحوم مالک ریاض الاخبار بھی دہلی گئے۔ کیمپ کے سوا۔ مولانا ابو المنصور مرحوم امام فن مناظرہ کے دولت خانے پر بھی مہمان بننا پڑا۔ شب گزاری کا اتفاق وہیں ہوتا۔ کیمپ میں پنجابی اخبار لاہور کا خیمہ ہماری شرکت میں تھا۔ مولانا مرحوم کے بڑے صاحبزادے خان بہادر سید ناصر علی صاحب غالباً موجود نہ تھے، بعد کو آگئے۔ آپ کے چھوٹے بھائی سید نصرت علی صاحب

مالک نصرت الاخبار دہلی کا زیادہ ساتھ رہتا۔ مولانائے مرحوم کی طرف سے مہماں نوازی کا بار انھیں پر تھا۔

دن تو والیانِ ملک کے عالی شان پرفضا فردوسی کیمپوں میں گزرتا جو دہلی کے باہر کوسوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہر کیمپ میں لہلہاتے ہوئے چمن زار سجے ہوئے بازاران کی وضع و قطع ان کی آراستگی۔ یہ بھولا ہوا خواب کہاں بیان کرسکتا ہوں۔ تمام اڈیٹران اخبار میری ہی طرح کیمپوں کی گلگشت میں رہ کر بقدر مراتب نفع اندوز ہوتے۔ اسی گلگشت میں ظہیر دانور مرحوم سے بھی شرف نیاز حاصل ہوا۔ میری باریابی نواب مردان علی خاں صاحب بہادر خیرپور سندھ کے حضور میں بہ امتیاز خاص ہوئی تھی۔ مگر بلے صرف دوسو روپے، حضور نواب صاحب اور تمام درباری فارسی زبان کا استعمال کرتے تھے۔ خان قلات کے کیمپ میں بھی دو ایک اخبار نویس پہونچے۔ امیر قلات نے جب دریافت کیا کون لوگ ہیں تو کہنے والے نے کہا کھبر والا۔ امیر صاحب ان کو گورکن سمجھے۔ تنغض پیدا ہوا اور وہ کیمپ کے باہر کردئے گئے۔

مجھے مہاراجہ کشمیر کے کیمپ میں جانے کا اتفاق اس بنا پر ہوا تھا کہ مہاراجہ اس سے پیشتر جب رونق افروز لکھنؤ تھے تو سیٹھ سیتا رام صاحب تعلقدار بسواں جن کے روابط مہاراجہ سے تھے مجھے بھی اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ مگر اس وقت مہاراجہ بعزم واپسی سوار ہو رہے تھے۔ سرسری شرف تعارف حاصل ہوسکا۔ دربار دہلی کی تقریب میں سیٹھ صاحب موصوف بھی تشریف فرمائے دہلی تھے۔ مجھے بھی مہاراجہ کے کیمپ میں ہمراہ لے گئے، درباری کیمپ کے قریب پہونچکر ہم نے دیکھا کہ درباری کیمپ سے شمس العلماء مولانا عبدالحق صاحب علامۂ خیرآبادی کسی قدر منغض آرہے ہیں۔ کشمیر کے ایک اعلیٰ افسر بھی لجاجت کناں ساتھ ہیں۔ مولانا اسی تنغض کے ساتھ فٹن پر سوار ہوگئے۔ ہم لوگ ایڈی کانگ کے خیمے میں چلے آئے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ سیٹھ صاحب نے استفسار فرمایا۔ کیا واقعہ ہے۔ جواب ملا اس وقت مہاراجہ سے ملاقات نہیں ہوسکتی واقعہ یہ پیش آگیا ہے کہ شمس العلماء کے تشریف لانے کے واسطے یہ وقت مقرر کیا گیا تھا، شمس العلماء تشریف لائے۔ مہاراجہ نے براہ تعظیم گوشۂ مسند پر جگہ دی۔ مزاج پرسی فرمائی، ساتھ ہی حکم دیا کہ ولیعہد کے اتالیق مولانا صاحب کو بھی تکلیف دو، وہ بھی تشریف لائے، مہاراجہ نے انھیں بھی براہ تعظیم شمس العلماء کے مقابل گوشۂ مسند پر جگہ دی۔ ممکن ہے شمس العلماء کی نازک مزاجی نے اسے پسند نہ کیا ہو۔ مہاراجہ نے فرمایا مجھے مدت سے آرزو تھی کہ ایسے بلند پایہ علماء کا کسی مسئلہ پر مناظرہ دیکھوں، یہ سنتے ہی شمس العلماء نے برافروختگی کے ساتھ کہا۔ مہاراجہ آپ نے مرغ اور بٹیر کی پالیاں دیکھی ہوں گی۔ علماء کی یہ شان نہیں ہے۔ ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے مہاراجہ کو عرق آگیا۔ شمس العلماء کے روانہ ہوتے ہی مہاراجہ نے افسر اعلیٰ کو بہ ندامت کچھ ایما فرمایا۔ وہ شمس العلماء کے ہمراہ لجاجت کناں خنس تک آئے شمس العلماء نے کچھ جواب نہیں دیا سوار ہوگئے۔ ہم لوگ بھی بغیر ملاقات واپس آئے، مہاراجہ پر اس ناگوار واقعہ کا زیادہ اثر تھا۔ میں شمس العلماء کی خدمت میں انکی فرودگاہ پر برابر جایا کرتا تھا۔ مجھے معلوم ہوا، دوسرے روز مہاراجہ کشمیر نے افسر اعلیٰ کے ذریعہ سے گیارہ پارچے کا خلعت اور نقد دو ہزار روپے معذرت کے ساتھ شمس العلماء کی خدمت میں بھیجے۔ شمس العلماء نے بجواب کہا آپ میری طرف سے معذرت اور اظہار افسوس اس وقتی اتفاق پر کیجئے گا مجھے افسوس ہے کہ مہاراجہ نے براہ قدردانی خلعت و نقد سے عزت افزائی کی۔ مگر میں اس کے قبول کرنے سے معذور ہوں کیونکہ میں رئیس رامپور کا ملازم ہوں۔ رئیس کی اجازت و منظوری کی ضرورت ہے۔ افسر اعلیٰ مع خلعت و زر نقد واپس گئے۔ یہ پرچہ نواب مشتاق علی خاں بہادر دلی عہد رام پور کو اپنے کیمپ میں گزرا۔ خلد آشیاں بیماری کی وجہ سے دہلی آنے اور دربار قیصری میں شرکت سے معذور تھے۔ پرچہ گزرنے پر خلد آشیاں کو اس واقعہ کی اطلاع تار پر دی گئی۔ تار ہی پر جواب آیا۔ ہماری طرف سے گیارہ پارچے کا خلعت اور نقد دو ہزار شمس العلماء کی خدمت میں پیش کردیا جائے۔ ایسا ہی ہوا۔ شمس العلماء جو کسی بات پر بدارالمہام رامپور سے برہم ہوکر دہلی اس غرض سے آئے تھے کہ واپس نہ جائیں اور کسی ریاست میں ملازمت کرلیں۔ اس قدر افزائی پر دربار قیصری کے بعد رام پور پہنچے آئے اور پھر خلد آشیاں سے کبھی جدا نہ ہوئے۔ اول سر سالار جنگ بہادر بھی نابالغ فرماں روائے دکن اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں بہادر کی معیت میں رونق افروز اپنے شاہی کیمپ میں تھے۔ وہیں ہم لوگوں کو اڈیٹر صاحب، جریدۂ روزگار مدراس اور حیدرآبادی عفو صاحب سے ملنے کا بار بار اتفاق ہوا۔ ایک روز ہم لوگوں کو گشت میں شام ہوگئی۔ شہر کو واپس آتے ہوئے پرنس آف ارکاٹ مدراس کے کیمپ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ نواب ناظر علیخاں بہادر

خیرآبادی خویش پرنس آف ارکاٹ پرنس کے ہمراہ شرکت دربار کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ ممدوح ہمارے اور نظام اللہ مرحوم کے قریبی بزرگ عزیز تھے۔ دن میں سوا ناشتے کے کچھ کھانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا ملکر جلد واپس ہونے کا قصد تھا۔ ۸ بجے شب کو واپسی کی اجازت چاہی مگر فرش پر دسترخوان بچھ چکا تھا۔ پہلے مجھ سے یہ اصرار کیا گیا مگر میں نے معذرت کی جب نظام اللہ مرحوم سے کہا گیا وہ بے تکلف دسترخوان پر نظر آئے، میری طرف مڑکر بھی نہ دیکھا کہ میں اشارے سے کچھ کام لیتا میرے لئے صبر کے سوا چارہ کیا تھا۔ کھانے کے ساتھ۔ سرخ، سبز مختلف رنگ کی مداسی شیرینی بھی تھی نظام اللہ مرحوم نے اس کے لئے بھی اشارہ کیا۔ قہر گرسنہ برجان گرسنہ دسترخوان ختم ہوا تو خواب گاہ کے اندر میزوں کی طرف طشتریاں جاتی نظر پڑیں۔ کچھ دیر کے بعد میں نے اجازت چاہی، بزرگ ممدوح نے فرمایا شہر بہت دور ہے، رات زیادہ گئی ہے واپس نہیں جاسکتے۔ میں کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ نظام اللہ مرحوم نے منظور کرلیا۔ خواب گاہ میں سامان استراحت ہوگیا۔ سب حضرات آرام فرمانے لگے۔ گرسنگی کی شدت میں کروٹیں بدل رہا تھا۔ نیند کا کیا ذکر۔ روشنی کم کردی گئی تھی۔ مجھے کچھ سہارا تھا تو رنگین شیرینی کی طشتری کا۔ جب ہر طرف سے نفیر خواب بلند ہوئی میں اُٹھا اور دبے پاؤں میز کے قریب پہونچکر ہاتھ بڑھایا۔ ڈلی کا محسوس ہونا تھا کہ وہ منہ کے اندر پہونچ گئی۔ میں چاہتا یہ تھا کہ زبان پر پہونچنے سے پہلے حلق میں اُتر جائے مگر وہ کمبخت سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گئی نہ اُگلنے کی نہ نگلنے کی۔ رقیق شے ہوتی تو آپ مئے تلخ کا دھوکا کھاتے یہ رنگین شیرینی کی ڈلی نہ تھی، صابن کی بٹی تھی، میری مصیبت کا پورا لطف اُٹھانا ہو تو کچھ دیر کے لئے صابن کی ٹکیہ منہ میں رکھ کر کام و دہن کو ممنون کیجئے۔ رومال سے صاف ہوکر وہ چیز وہیں گئی، جہاں سے اُٹھائی گئی تھی۔ پانی کی تلاش میں کسی کی آنکھ کھل جانے کا اندیشہ تھا رومال کی کارفرمائی منہ کے اندر بھی رہی اس آسانی سے پلنگ تک نہ پہونچ سکے، جس طرح وہ چیز منہ تک پہونچی تھی۔ اب صابن اپنی جگہ پر تھا۔ مگر اس کی لذت زبان پر۔ سب حضرات پابند نماز تھے نماز فجر ادا کی۔ ساتھ ہی چائے مع بسکٹ وغیرہ سامنے آگئی۔ میں نے دو چار گھونٹ پی کر بسکٹ اُٹھا کر اتنے زیادہ پیالی میں ڈالے کہ بزرگ ممدوح کو میری طرف توجہ ہوگئی، دوسری پیالی بڑھا کر کہا اب بسکٹ اس میں ڈالے جائیں، نظام اللہ مرحوم کو ہنسی آگئی جو معنی چیز تھی استفسار پر انھوں نے کہا آپ تمام دن بھوکے رہے تھے۔ پھر بھی شب کو کھانے میں تکلف کیا۔ واپسی کا بھی سہارا ٹوٹا۔ چائے میں تکلف خجلت ہوگیا۔ آپ بسکٹ سے زیادہ بے تکلف ہوگئے۔ میں دل میں خوش تھا کہ خدا نے صابن کے واقعہ کا پردہ رکھ لیا۔ نیاز صاحب یہ اُسی کا اثر تھا کہ آپ نے جب کہا آپ کے ساتھ کھانے میں اس طرح شریک ہوگیا جس طرح کسی کافر کے ساتھ پینے میں۔ خدا کرے یہ کہنے کا کہیں جلد موقع ملے ؎

یہ چھلکتا ہوا کیا جام شراب آتا ہے　　اے میں قربان مرا عہدِ شباب آتا ہے

کیا صابن کا واقعہ۔ صحیح مذاق شعری رکھتے ہوئے آپ کے لئے اچھے شعر سے کم ہے۔

اب دربار دہلی کا ذکر چھوڑتا ہوں اس کے لئے بوستانِ خیال کی ضخامت درکار ہے۔ کمبخت کی یاد یاد جوانی سے کم نہیں۔ یہی کہتے ہوئے وہاں رہے اور یہی کہتے ہوئے واپس ہوئے ؎ ریاض

دربار قیصری کے عجب رنگ ڈھنگ ہیں　　دہلی ہے اور ہم ہیں بتانِ فرنگ ہیں

میں دہلی سے آگرے آیا۔ میرے والد ماجد مولوی سید طفیل محمد کوتوال آگرہ تھے دو چار روز ٹھہر کر براہ مراد آباد رام پور پہونچا۔ استاد مرحوم نے سرکاری مہمان نہ بننے دیا۔ اپنے یہاں ٹھہرایا۔ سرکار سے اجازت لے لی تھی، دوسرے روز جناب داغ، جناب منیر اور بعض شعرا مجھ سے ملنے آئے میں بھی سب حضرات کی خدمت میں تا قیام حاضر ہوتا رہا۔ وہ سب حضرات بھی تشریف لاتے رہے۔ جان صاحب مشہور ریختی گو دو بار روزانہ آتے تھے۔ یہی زمانہ تھا کہ سرکار کا فارسی دیوان، لسان الملک وزیر ایران کی اصلاح سے مزین و معزز سفیروں کی معرفت رام پور آیا تھا، سفیر سرکاری مہمان تھے۔ ہر طرف اصلاحات دیوان کا چرچا تھا۔ خلد آشیاں کا شغف خاطر بڑھا ہوا تھا۔ میں برسم دیرینہ نواب آفتاب الدولہ خلق سے جاکر ملا جناب اسیر موجود نہ تھے۔

شعراء علماء فضلاء و دیگر ممتاز حضرات روزانہ دربار میں جاتے دربار کا وقت ایک بجے سے ۴ بجے تک تھا، درباری حال سے ملا ہوا ایک کمرہ استاد مرحوم کے لئے عوارض کی وجہ سے مخصوص تھا۔ درباری نشست گاہ سے کچھ دور مصاحب منزل کی عمارت تھی۔ سب حضرات

وہاں موجود رہتے - سرکار جسے یاد فرماتے چوبدار نام لے کر درباری ہال کے آخری دروازے سے پکارتا۔ حضور یاد فرماتے ہیں۔ یہ سلسلہ تادیر جاری رہتا

خلد آشیاں کا شاہی رعب ہر ہستی پر بہت زیادہ اثر انداز تھا، البتہ شمس العلماء مولانا عبدالحق علامہ خیرآبادی اس سے مستثنیٰ تھے۔ میں بھی مصاحب منزل میں وقت سے پہلے حاضر ہوا۔ جناب داغ، جناب منیر علامہ خیرآبادی نیز دو چار صاحب اور تشریف فرما تھے۔ آنے کا سلسلہ جاری تھا۔ مصافحہ و معانقہ و مزاج پرسی کے بعد جناب داغ نے بہ اصرار کچھ سنانے کے لئے مجھ سے ایما فرمایا۔ بہ تعمیل ارشاد میں نے یہ مطلع پڑھا:-

ہنگام نزع گر یہ یہاں بیکسی کا تھا تم ہنس پڑے یہ کون سا موقع ہنسی کا تھا

تحسین و آفرین کی آواز ہر طرف سے ہمت افزائی کے لئے آئی۔ اسی طرح ہر شعر کی داد مجھے ملی۔ میں نہیں کہہ سکتا تقاضائے اخلاق و مہماں نوازی تھا یا واقعی اشعار اس کے مستحق تھے۔ اس ضمن میں ایک شعر ایسا تھا جو بعض حضرات کو یاد رہ گیا۔ میں وہ شعر بھی آپ کے ملاحظہ کے لئے نقل کئے دیتا ہوں ؎

یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش سن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

اب یاد فرمائی کا سلسلہ شروع ہوگیا، آواز آئی۔ مولانا عبدالحق صاحب کو حضور یاد فرماتے ہیں۔ اسی طرح منیر و داغ اور دیگر حضرات تشریف لے گئے، تیس بتیس کے بعد میرا نمبر آیا۔ خسخانے میں بیرونی روشنی سے آتے گونہ تکلف ہوتا تھا۔ میں اس دروازہ پر پہونچا، نگہ روبرو کی صدا بلند ہوتی تھی۔ آواز کے ساتھ ہی مجھے سلام کے لئے جھکنا پڑا۔ درباری سب آداب، استاد مرحوم سے دریافت کر کے نقش دل کر چکا تھا۔ سرکار کی نشست تقریباً وسط حال میں مسہری پر تکیوں کے سہارے تھے۔ ایک صف مسہری کے روبرو جنوب میں استاد مرحوم سے شروع ہو کر کسی اور پر ختم ہوئی ہے دونوں صفوں کے مابین، کچھ جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔ جس سے نگہ روبرو کی منزل طے کر کے مجھے نذر دینے مسہری کی طرف بکمال دست بستہ نیچی نظر کئے۔ خسخانہ کی خوشگوار کم کم روشنی میں سنگ مرمر کی خنک فرش پر سے گزرنا پڑا۔ نذر پیش کی قبول ہوئی۔ واپسی میں بھی رخ خلد آشیاں کی طرف تھا۔ خدا نے بخیر و خوبی منیر کے برابر نشست کی، مشکل آسان کی زانو شکستہ دست بستہ نیچی نگاہ کئے بیٹھ گیا۔ سرکار نے فرمایا ہمارا کچھ کلام ریاض کو سناؤ۔ جناب داغ نے اپنے قامت سے زیادہ کشیدہ و بلند آواز سے اپنے مخصوص انداز میں سرکار کے اشعار سنائے۔ کبھی حضور خود قافیہ و ردیف اور کسی غزل کا مصرع داغ صاحب کو بتا دیتے۔ جس طرز خاص سے اشعار کی داد دیجاتی تھی، اس نے حضور کو اس قدر لطف اندوز کیا کہ خود حضور اپنے شعر سنانے لگے۔

دیر تک یہ رنگ قایم رہنے کے بعد ارشاد فرمایا۔ ریاض تم کو فارسی کا بھی شوق ہے۔

سنتے ہی روح مایل پرواز نظر آئی اس لئے کہ اصلاحی دیوان فارسی دیکھنے کا استاد مرحوم نے کچھ موقع اپنے دولت خانہ پر دیدیا تھا، جس میں بہ کثرت عربی فارسی کے لغت۔ بندشیں خاص۔ بلند مطالب کے سوا زبان بدلی ہوئی۔

مجھے جواباً عرض کرنا پڑا۔ حضور کے فارسی کلام کا بہت مشتاق ہوں۔ حضور نے استاد مرحوم سے بہ اظہار قافیہ مخصوص قصیدہ سنانے کی فرمایش کی، چوبدار دیوان لایا۔ اُستاد مرحوم نے اپنے خاص انداز میں بلند آواز سے مطلع پڑھا، مجھے اتنا موقع مل گیا تھا کہ منیر مرحوم سے اشارہ کر سکوں، روشن ضمیر منیر یقیناً میرا مفہوم سمجھ گئے آپ نے اس وضاحت سے لفظ لفظ کی تعریف کی کہ مجھے منیر کے ساتھ ہمنوا رہنے میں زیادہ دقت نہیں پیش آئی، قصیدہ ختم ہونے پر زیادہ وقت گزر جانے سے یکے بعد دیگرے حضرات رخصت ہونے لگے۔ میں بھی اسی سلسلہ میں اپنی قیام گاہ تک پہونچ گیا۔ درباری نشست جس کا اتفاق پھر بھی ہونے والا تھا ایسی نہ تھی کہ میں اسے کبھی بھول سکوں، میں جاتے ہی بیمار ہوگیا اور مصنوعی صحت بھی قایم نہ رکھ سکا۔

دوسرے روز استاد مرحوم نے دربار سے واپس آنے پر سرکار کی ایک غزل تضمین عطا فرمائی اور بہ ایمائے سرکار اسی طرح میں غزل کہنے کے لئے بھی ارشاد فرمایا۔ بیماری نے حاضری دربار سے مطمئن کر کے مجھے فکر کا اچھا موقع دیدیا۔ غزل بھی کہی، مصرعے بھی لگائے آپ اگر چاہیں گے تو ناظرین نگار کے روبرو مجھے پیش کرنے میں عذر نہ ہوگا۔

میں تو عذر بیماری سے سرکار میں جا نہ سکا۔ استاد مرحوم نے تضمین بھی پیش کی اور غزل بھی۔ وقت حضوری سرکار نے مجھ سے ارشاد کیا اگر مشقِ سخن رہی تو مجھ سے گوئے سبقت لے جاؤ گے۔

اشعار مندرجۂ ذیل حاضرین کو بھی سنائے گئے۔ منیر و داغ نے بھی مجھ سے تعریف کی یہ دونوں شعر لوگوں کو یاد بھی ہو گئے خصوصاً دوسرا شعر وہ شعر یہ ہیں :-

جس کا تمام خلق نے رکھا ہے خضر نام — بھٹکا ہوا یہ کوئی مرا نامہ بر نہ ہو
باہم شبِ وصال اُٹھائے ہیں کیا مزے — وہ بھی یہ کہہ رہے ہیں الٰہی سحر نہ ہو

خلد آشیاں نے چاہا میں رام پور سے واپس نہ جاؤں۔ ماہوار بھی تجویز فرما دی۔ استاد مرحوم نے مجھ سے مشورہ فرما کر اخبار و پریس کی وجہ سے فوراً تعمیل ارشاد میں میری طرف سے اظہار معذرت اور چند روز کے بعد وعدہ حاضری کا اظہار فرمایا جس روز میں رخصتی سلام کو جانے والا تھا اس سے ایک دن پیشتر استاد مرحوم نے افسردگی کے ساتھ مجھ سے فرمایا کہ شمس العلماء اور داغ صاحب نے ذکر آنے پر سرکار سے عرض کیا کہ دیوان ناظم کی مطبوعہ جلدیں بہ احتیاط کتب خانے میں مدت دراز سے رکھی ہوئی ہیں اگر ریاض کو مرحمت فرمائی جاویں تو پریس و اخبار کی وجہ سے وہ بہت کافی طور پر نفع اندوز ہو سکیں گے۔ سرکار نے بھی یہ تجویز پسند فرمائی۔ میں نے استاد مرحوم سے عرض کیا خیر آباد ایسا مقام ہے جہاں کاغذ بھی آسانی سے فراہم نہیں ہو سکتا۔ استاد مرحوم نے فرمایا آپ ہی سرکار میں وقت رخصت عرض کریں میں خود کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا

میں نہایت افسردگی کے ساتھ دوسرے دن، سلام رخصت کی غرض سے حاضر دربار ہوا' سرکار نے بہ لطف خاص ارشاد فرمایا کہ ریاست کو ہمیشہ اپنا گھر سمجھو اور حسب وعدہ تا امکان بے نظیر کے میلے سے کچھ قبل آجاؤ۔ میں نے عزت افزائی پر دلی شکریہ ادا کیا۔ کچھ غدر کا ذکر اور ریاست کی خدمات بیان فرمائے۔ ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا کہ ریاض الاخبار میں اس کا ذکر نہ آنے پائے۔ آخر میں حسب ایما چوبدار۔ ایک کشتی حضور کے روبرو لایا۔ مجھے بھی قریب جانا پڑا۔ حضور نے خلعتی دوشالہ اپنے دست مبارک سے میرے زیب دوش کیا۔ مقررہ آداب دربار کے موافق باادب سلام کر کے جب مکان کو روانہ ہوا تو بے ساختہ یہ شعر موزوں ہو گیا ؎

ریاض اس درجہ وہ نواب کی بخشش پہ عاشق تھی — لپٹ کر رہ گئی تقدیر خلعت کے دوشالے میں

استاد مرحوم دربار میں آج تشریف نہیں لے گئے تھے۔ منتظر تھے کہ کاغذ خیر آباد میں نہ فروخت ہونے کی معذرت کا کیا نتیجہ ہوا۔ استاد مرحوم سے زیادہ جناب مفتی طالب حسین صاحب برادر معظم امیر مینائی مرحوم جو غالباً اس وقت مفتی عدالت تھے اور جامع کمالات بھی میرے نتیجۂ رخصت کے منتظر تھے۔ میری واپسی خلعتی دوشالہ عطا ہونے سے بہت خوش ہوئے یہ ذکر ہو ہی رہا تھا کہ گیارہ چوبدار وردی پوش مع جمعدار کے کشتیاں سربلند لئے ہوئے آئے۔ جمعدار نے استاد مرحوم سے عرض کیا۔ سرکار نے ریاض صاحب کے لئے یہ کشتیاں بھیجی ہیں۔ ہر کشتی میں دس یا پندرہ جلدیں دیوان ناظم کی تھیں اور ایک کشتی میں کچھ پارچہ اور دو سو روپیہ نقد کے ساتھ، کسی چیز کے لے لینے میں مجھے کیا عذر ہو سکتا تھا۔ استاد مرحوم مع موجودین بہت خوش ہوئے۔ چوبداروں کو استاد مرحوم نے زر انعام دیکر رخصت کیا اور مجھے زردار بنا کر۔

عالم ہمہ افسانہ مادر دو ما ہیچ

ایک غلطی کی تصحیح

اکتوبر کے نگار میں حضرت نیاز فتحپوری کی غزل کا مصرعۂ ذیل غلط چھپ گیا ہے :-

تھا دل کا مٹانا مدِ نظر تو لطف سے لیتا کام ذرا

کاتب صاحب نے غلطی سے "کام لیتا" لکھ دیا تھا۔ منیجر

اسلام و شریعت
اور
دین و مذہب کا فرق

کیا آپ نے کبھی اس پر غور فرمایا ہے کہ اسلام و شریعت دونوں ایک چیز ہیں یا ان کا مفہوم جداگانہ ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اگر یہ ایک ہیں تو کیوں اور مختلف ہیں تو ان دونوں میں باہم کیا تعلق ہے۔

آپ جس چیز کو لفظ شریعت سے تعبیر کرتے ہیں وہ فی الحقیقت فقہ اسلامی ہے اور اکثر مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ فقہ اور مذہب اسلام دونوں ایک چیز ہیں اس لئے سب سے پہلے فقہ کی حقیقت سمجھ لیجئے۔

اس میں کلام نہیں کہ شریعت یا فقہ نام ہے اس مجموعۂ قوانین کا جو مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور تمدنی زندگی پر حاوی ہے اور جس کی حدود سے ان کی انفرادی یا اجتماعی زندگی کا کوئی پہلو بچا ہوا نہیں ہے لیکن یہ دعوےٰ کرنا کہ ہمارے اسلاف جو قوانین وضع کر گئے ہیں ان میں تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں یا یہ کہ ان سے ہٹنا مذہب اسلام سے ہٹ جانا ہے کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس زمانہ میں فقہ کے مفہوم کو جو اتنی اہمیت دیدی گئی ہے وہ ابتداءِ عہدِ اسلام میں مفقود تھی۔

اگر آپ نے تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قرونِ اولیٰ میں فقہ کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور چیز بھی پائی جاتی تھی جس کا اصطلاحی نام علم تھا اور جو فقہ سے بالکل جدا حیثیت رکھتی تھی۔

علم سے مراد قرآن و تفسیر کا علم تھا اور ان روایات کا جو رسول اللہ اور صحابہ سے منسوب کی جاتی تھیں لیکن فقہ سے (جیسا کہ اس کے لغوی معنی سے ظاہر ہے) مراد عقل و رائے کے بعد کسی نتیجہ تک پہونچنا تھا، اسی لئے کبھی کبھی الفاظ فقہ اور رائے مترادف حیثیت سے استعمال کئے جاتے تھے۔ الغرض علم اور فقہ دو بالکل علیحدہ علیحدہ چیزیں تھیں اور اسی بنا پر مجاہد نے (من یوتی الحکمۃ) کی تفسیر میں ظاہر کیا ہے کہ صاحب حکمت سے مراد وہ شخص ہے جو قرآن، علم اور فقہ کا ماہر ہو، ہارون الرشید اپنے گورنر ہرثمہ کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ "اولوا الفقہ فی الدین" اور "اواولوا العلم بکتاب اللہ" سے مشورہ کرتا رہے الغرض عالم اور فقیہ دو بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اور اسی بناء پر ابن عمر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جید الحدیث تھے، لیکن "جید الفقہ" نہ تھے اور ابن عباس، فقہ و علم دونوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے، بالفاظ دیگر گویا یوں سمجھئے کہ عالم وہ شخص کہلاتا ہے جسے صرف قرآن اور روایات کا علم ہو اور فقیہ وہ کہلاتا ہے جو جدید مسایل میں غور و فکر کے بعد خود اپنی رائے سے کام لے کر کوئی فیصلہ کرے۔

جب اسلام بالکل ابتدائی دور سے گزر کر ارتقاء کی دوسری منزل میں آیا اور فتوحات کی وسعت کے ساتھ اسے غیر قوموں کے تمدن اور نئے نئے مسایل سے واسطہ پڑا تو بہت سی باتیں ایسی نظر آئیں جن کا ذکر نہ کلام مجید میں تھا نہ رسول اللہ کے اقوال میں، اس لئے جن علماء کو عدل و انصاف کی خدمت سپرد کی گئی تھی وہ اپنی عقل و رائے سے کام لیتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو علم و رائے دونوں ملجائیں اسی کا نام "تفقہ فی الدین تھا اور جو اس میں سب سے زیادہ کامیاب ہوتا تھا اسی کو سب سے بڑا فقیہ سمجھا جاتا تھا۔ الغرض شریعت اسلامی میں جو مرتبہ علم قرآن و حدیث کا تھا وہی بلکہ اس سے زیادہ رائے کا تھا کیونکہ بغیر اس کے کام چلنا دشوار ہو جاتا

ایک بار امیر معاویہ نے زید بن ثابت سے کسی امر میں قانونی مشورہ کیا لیکن "فلم یوجد عندہ او عندہم فیہا علم" (نہ وہ کوئی روایت پیش کر سکے نہ دیگر حضرات) آخر کار امیر معاویہ نے اپنی ذاتی رائے سے فیصلہ کیا۔ ایک بار مصر کے قاضی نے خلیفہ عمر ثانی سے کسی معاملہ کے متعلق دریافت کیا۔ آپ نے جواب دیا کہ مجھ تک اس باب میں کوئی روایت نہیں پہونچی اس لئے خود اپنی رائے سے کام لے کر فیصلہ کر دو۔

بنو امیہ کے زمانہ تک باقاعدہ تنظیم شریعت نہ ہو سکی تھی، لیکن بنو عباس کے دور میں البتہ قانون سازی کی ابتدا ہوئی اور اس کے چار اصول مقرر کئے گئے قرآن، سنت، قیاس اور اجماع۔ چنانچہ ان اصول پر فقہ اہل سنت کی جو کتاب سب سے پہلے مرتب کی گئی وہ مالک ابن انس کی موطا ہے، اس وقت علاوہ مدینہ کے شام، عراق اور ہسپانیہ میں بھی مختلف حضرات اپنی اپنی فقہ مرتب کر رہے تھے لیکن سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت موطا ہی کو حاصل ہوئی۔ اس کے بعد عراق کی رائج کردہ فقہ کو حماد بن ابی سلیمان نے سنبھالا اور پھر ابو حنیفہ نے اس کو چار چاند لگا دئے اور بعد کو ان کے دو شاگرد ابو یوسف اور محمد کی خدمات تدوین شریعت میں بہت مقبول ہوئیں اور انھیں کی مرتب کردہ فقہ پر آج کل اہل سنت عمل کر رہے ہیں۔

یہ تھا نہایت مختصر سا بیان تدوین فقہ کی تاریخ کا لیکن اس کے ساتھ آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ مسایل شریعت میں تمام مسلم جماعتوں کا اتفاق کبھی نہیں ہوا اور ٹھیک اسی وقت جبکہ قیاس اور رائے سے کام لے کر قوانین و قواعد مرتب ہو رہے تھے ایک جماعت ایسی بھی تھی جو اس کی سخت مخالف تھی اور وہ کہتی تھی کہ قرآن و حدیث میں کیا چیز نہیں ہے کہ ہم کو قیاس و رائے سے کام لینا پڑے۔ بعد کو یہ اختلاف برابر بڑھتا ہی گیا اور کبھی کوئی ایسی شریعت قایم نہ ہو سکی جس پر تمام سنیوں نے بھی اتفاق کیا ہو چہ جائیکہ شیعہ اور خوارج وغیرہ کہ اگر ان کو بھی لے لیا جائے تو پھر اختلاف کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

اس بیان سے دو باتیں واضح ہو گئیں، ایک یہ کہ جس چیز کو شریعت اسلامی سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ کوئی منصوص چیز نہیں ہے، یعنی نہ خدا کی نازل کی ہوئی چیز ہے اور نہ رسول اللہ کی بنائی ہوئی اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں میں کبھی کوئی ایسی شریعت نہیں پائی گئی جس پر بالاتفاق سب کا عملدرآمد رہا ہو۔ اب اس حقیقت کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ یہ دعویٰ کرنا کہ شریعت یا فقہ میں تغیر و تبدل کو راہ دینا اسلام کو خراب کرنا ہے کس حد تک درست ہو سکتا ہے۔

اس بحث میں لوگ اس حقیقت کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں کہ دین و مذہب دو علٰحدہ علٰحدہ چیزیں ہیں، دین سے مراد وہ اصولی عقاید ہیں جو تمام افراد میں جزو مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ مثلاً یہ کہ خدا ایک ہے اور محمدؐ اس کے رسول ہیں لیکن اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ مذہب ہے، اگر اس میں اختلاف بھی ہو تو اس کا اثر "وحدت فی الدین" پر نہیں پڑتا اور اسی بنا پر ایک زمانہ سے یہ کہتا چلا آرہا ہوں کہ شیعہ، سنی کے جھگڑے دین سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اور ان کا تعلق ان مسایل سے ہے جو ہماری دینی مرکزیت یا اسلامی اجتماعیت پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

مذہب جس میں ہمارے سیاسی، معاشرتی اور تمدنی قوانین سب شامل ہیں کبھی متفق علیہ چیز نہیں ہو سکتا اور نہ ایک جگہ قایم رہنے والی چیز ہے کیونکہ زمانہ کے ساتھ ساتھ ہمارے تمدن، ہماری معاشرت، ہمارے عادات و اطوار اور ہماری ضروریات میں تغیر ہونا ضروری ہے اور تہذیب یا کلچر کے اس تغیر کے ساتھ ہمارے اجتماعی نظام کا بدلنا بھی لازم ہے چنانچہ آپ دیکھئے کہ آج خود ہمارے علمائے کرام کی تہذیب و معاشرت کیا ہے کیا یہ بالکل وہی ہے جو عہد رسالت و خلافت میں پائی جاتی تھی، اگر نہیں ہے تو آپ ان سے بھی کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے شریعت کی پابندی نہیں کی کیونکہ قانون اسلامی میں ہمارے لباس وغیرہ بھی شامل ہیں۔

اس سے تو آپ کو انکار نہ ہوگا کہ علوم و فنون کی ترقی نے اس وقت زمان و مکان دونوں کے مفہوم کو بدل دیا ہے اور تجارت نے ہر ملک و قوم کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ زندگی کے مشاغل بہت وسیع ہو گئے ہیں اور ایسے ایسے مسائل ہمارے سامنے آگئے ہیں جن کا اب سے قبل وجود تو خیر کیا وہم و گمان بھی نہ تھا، ظاہر ہے کہ جب رسول اللہ کے بعد ہی معاشرت کی گتھیاں سلجھانے میں لوگوں کو

قرآن و احادیث سے ہٹ کر قیاس و رائے سے کام لینے کی ضرورت پڑی تو اب کہ زمانہ اتنی ترقی کر چکا ہے اور ہزاروں نئی باتیں پیدا ہو گئی ہیں، ہم قیاس و رائے سے کیونکر قطع نظر کر سکتے ہیں اور وہ شریعت جو اب سے صدیوں سال قبل مرتب ہوئی تھی، وہ ہماری موجودہ زندگی میں کیا کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ قانون ہمیشہ اقوام کی زندگی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اگر کسی مذہب میں اتنا لچک نہیں ہے کہ وہ ضروریات ملک و ملت کے لحاظ سے اپنے اندر تبدیلی پیدا کر سکے تو وہ قطعاً بے روح مذہب ہے اور زیادہ عرصہ تک قایم نہیں رہ سکتا۔ اگر میں یہ کہتا ہوں کہ شریعت میں تبدیلی کی ضرورت ہے تو کوئی نئی بات نہیں کہتا بلکہ اسی مطالبہ کا اعادہ کرتا ہوں جو قرونِ اولیٰ میں اکابرین کی طرف سے کیا گیا تھا اور جس کا نتیجہ آپ کی موجودہ شریعت ہے۔

ظاہر ہے کہ سرزمین عرب میں جو قوانین مرتب کئے گئے تھے ان میں وہیں کی آبادی اور اسی زمانہ کے مقامی ماحول کو پیش نظر رکھا گیا ہوگا کیونکہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آج چین میں بیٹھ کر لندن کے لئے قانون وضع کیا جائے اور لندن میں بیٹھ کر چین کا۔ یا یہ کہ اس وقت ہم کوئی ایسی شریعت مرتب کر دیں جو ہزار سال بعد بھی کام دے سکے۔ پھر کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ جس وقت فقہ حنفی طیار ہوئی ہے اس وقت اہلِ عرب کو اس کا علم حاصل تھا کہ ایک وقت ہندوستان میں بھی اسلام پھیلے گا اور ان کو اپنی ملکی ضروریات کے لحاظ سے فلاں فلاں امور میں رشد و ہدایت کی ضرورت لاحق ہوگی یقیناً نہیں۔ پھر آپ کیونکر اس کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ شریعت اسلامی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بھی اتنی مفید و کارآمد ثابت ہو سکتی ہے جتنی اب سے سیکڑوں سال قبل عرب کے باشندوں کے لئے تھی اور اس میں اب کسی تغیر و تبدل کی گنجایش نہیں۔ اس سلسلہ میں ایک بات البتہ قابلِ غور ہے اور وہ بھی ان لوگوں کے لئے جو بہت زیادہ قدامت پرست ہیں) وہ یہ کہ فقہ اسلامی میں بعض مسایل ایسے ہیں جسکی صراحت قرآنِ مجید میں موجود نہیں، بعض احادیث سے لئے گئے ہیں اور بعض قیاس و رائے سے کام لے کر اجتہاد کئے گئے ہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید میں جو مسایل مذکور ہیں، ان کو جوں کا توں رہنے دیا جائے اور وہ ایسے ہیں بھی نہیں جن میں تغیر کی ضرورت زیادہ محسوس کی جائے، لیکن احادیث و قیاس کی مدد سے جو حصہ فقہ اسلامی کا مرتب ہوا ہے اس کو بدلا جا سکتا ہے اگر اس کی ضرورت محسوس ہو۔ ایسا کرنے سے اصل دین کو کوئی صدمہ نہیں پہونچ سکتا کیونکہ قرونِ اولیٰ میں بھی برابر اسی اصول پر عملدرآمد ہو رہا ہے اور اس کو سامنے رکھے بغیر شریعت اسلامی ہر زمانہ اور ہر ملک کے ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتی

نگار کے پچھلے فایل

سنہ ۳۲ء	=	جولائی تا دسمبر	= ——— =	۸؍
سنہ ۳۷ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ اصحاب کہف و خلافت نمبر) =	۱۵؍
سنہ ۳۹ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ مصحفی نمبر) =	۱۵؍
سنہ ۴۰ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ نظیر نمبر) =	۱۵؍
سنہ ۴۴ء	=	جولائی تا دسمبر	= ——— =	۸؍
سنہ ۴۶ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ انتقاد نمبر) =	۱۵؍
سنہ ۴۷ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ ماہدولین نمبر) =	۱۵؍
سنہ ۵۲ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ تنقید نمبر) =	۱۵؍

نوٹ :- صرف ایک ایک فایل موجود ہے اور سب سے پہلے جس کا آرڈر پہونچے گا اسی کو دیا جائے گا۔ قیمت محصول ڈاک کے علاوہ ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

روشن اندھیرے

(فضا ابن فیضی)

پاک دل پاک نگاہوں کی ضیا کچھ بھی نہیں

شمع جلتی ہے اُجالا ہے مگر دور بہت
آفتابوں نے بُنا اپنے سویروں کا کفن
چاند اپنی ہی شعاعوں کا پرستار رہا
اب کہاں بزم میں وہ روشنیِ جوشِ قدح
شب جواں فکر نہیں، صبح ہنر خیز نہیں
عقل و دانش کی ترازو ہے سیاست کا فریب

چاندنی رات کے سینے میں ہیں ناسور بہت
خون آلود رہی کتنے ستاروں کی کرن
آدمی "ذوقِ نمایش" میں گرفتار رہا
آنکھیں چہروں پہ ہیں کملائے ستارونکی طرح
گرمیِ شوق سے احساس کی لَو تیز نہیں
کتنے الزاموں کا گہوارہ ہے ناموس کی جیب

. . . . . .

جھوٹ کی قبر پہ یہ چادریں سچائی کی،
صفحۂ خار پہ کھینچی ہوئی تصویرِ گلاب
یہ اندھیرے کی دکانوں پہ شبِ ماہ کا مول،
یہ ضمیروں کی سیاہی پہ بزرگی کی شفق
گنہ و خبث پہ یہ زہد پرستی کے غلاف
کم نگاہی پہ بصیرت کا یہ رنگیں غازہ
یہ کلیساؤں میں بکتے ہوئے عیسیٰ و صلیب
برہمن خانہ کے یہ لعل اُگلتے ہوئے بُت
جسم پر زاغ کے یہ ہنس کے شہپر کے لباس
دولت و زر کی نمایش کا جنوں ہے طاری
گندگی ذہن کی ہے فاخرہ ملبوس میں بند
نور چہروں سے جھلکتا ہوا اور دل کالے
پاؤں میں اُلجھی ہوئی حرص و ہوس کی زنجیر
یہ لباسوں کے چم و خم کا "حریری پندار"

دیدۂ کور میں تحریر یہ بینائی کی
اُف یہ سونے کے پیالوں میں سم آلود شراب
سنگ ریزوں پہ چمکتے ہوئے ہیروں کا یہ خول،
کوئلوں پر یہ لپیٹے ہوئے چاندی کے ورق
گندگی اوڑھے ہوئے نکہت و نزہت کے لحاف
مرہموں پر ہے ابھی زخم کا خونیں غازہ
پی گئے اپنے مریضوں کا لہو خود ہی طبیب
اپنی ہی آگ میں دن رات یہ جلتے ہوئے بُت
یعنی ظاہر ہے یہاں خوبیِ باطن کی اساس
اُف یہ تہذیب و شرافت کی مرصع کاری
دیکھ! اُلجھی ہے کہاں جا کے نگاہوں کی کمند
رات کے گرد یہ مہتاب کے رنگیں ہالے
زندگی ہے "گہر طرف کلہ" کی حسا گیر
آدمیت کی ہیں معراج "سنہرے کردار"

زندگی فلسفۂ زر کے سوا کچھ بھی نہیں

ایشیا کا چاند

(روس کا مصنوعی چاند)

(رضا قریشی گوالیاری)

ایشیا کی عظمتیں توریت و انجیل و زبور
ایشیا کی رفعتیں کوہِ ہمالہ کوہ طور
ایشیا ہے سارے عالم کے لئے وجہ شعور

ایشیا سے ساری دُنیا کو سبق حاصل ہوا
ایشیا میں وید، گیتا اور قرآں نازل ہوا

یہ وہ گھر ہے رحمتِ عالم جہاں پیدا ہوئے
کرشن، ارجن، بودھ اور گوتم جہاں پیدا ہوئے
گیسوئے عرفاں میں پیچ و خم جہاں پیدا ہوئے

بابِ رحمت، مشرقِ عالم وہی ہے ایشیا
درس جو دیتا رہا پیہم وہی ہے ایشیا

مانی و بہزاد، حاتم اور رستم پہلواں
رام، لچھمن، تلسی اور نانک ہوئے پیدا یہاں
خوبیاں ہیں ایشیا کی داستاں در داستاں

"تاج" "اہرام" اور "الورا" کا ہے دامن ایشیا
سارے نبیوں، سارے رشیوں کا ہے مسکن ایشیا

کچھ تو ظاہر بھی یہاں ہے اور ہے کچھ راز بھی
عشق کی دیوانگی ہے حُسن کا انداز بھی،
ایشیا میں سوز بھی ہے ایشیا میں ساز بھی

سارا عالم جسم ہے تو ایشیا ہے جان بھی
ایشیا میں عشق بھی ہے حُسن بھی عرفان بھی

فلسفے کی ہر زمانے میں رہیں سرگرمیاں،
چاند مقنع کا بہت پہلے ہوا روشن یہاں
آسماں پر روس نے بھیجا ہے پھر اونچا نشاں

کتنا اونچا ہے نظارہ ایشیا کا آج بھی
ہے بلندی پر ستارہ ایشیا کا آج بھی

دوسروں کی زحمتوں کو دھیان میں لاتا نہیں
اپنے پچھلے کارناموں ہی کو گنواتا نہیں
ایشیا تاریخ ماضی ہی کی دہراتا نہیں

آج بھی ہے فلسفے سے اپنے وجہ افتخار
ایشیا عظمت جتاتا ہی رہا ہے بار بار

یورپ امریکہ بھی اب رکھے رہیں گے پانچ سال
دوڑ میں سائنس کے پیچھے رہیں گے پانچ سال
گتھیوں میں فکر کی اُلجھے رہیں گے پانچ سال

ایشیا کے فخر کی تائید کی پھر روس نے
عظمتِ دیرینہ کی تجدید کی پھر روس نے

راز ہائے رمزِ فطرت تا ابد یابندہ باد!
اے درخشاں آفتابِ فلسفہ تابندہ باد!!
اے مُبارک روس فخرِ ایشیا پایندہ باد!!!

اک طرف تو اک طرف امریکن و افرنگ ہیں
دیکھ کر تیرا کرشمہ اہلِ یورپ دنگ ہیں۔!؟

نیاز فتحپوری :-

لوگ کہتے ہیں کہ آج آپ نے کوسا مجھ کو،
وائے اگر اب بھی ہو جینے کی تمنا مجھکو

وسوسے دل میں گزرتے ہیں نہ جانے کیا کیا
آپ جایا نہ کریں چھوڑ کے تنہا مجھکو

آپ کو دیکھ کے ممکن تھا سنبھل جاتا میں
آپ نے بھی تو مگر لوٹ کے دیکھا مجھکو!

دیر بھی سیر کے قابل ہے، حرم بھی، لیکن
دیکھوں لے جائے کدھر ذوقِ تماشا مجھکو

آپ تھے، میں تھا، شبِ ماہ تھی، تنہائی تھی
ہائے وہ رات کہ دشوار تھا جینا مجھکو

اُف ری مجبوریِ اُلفت، یہ خبر کس کو تھی
تم کو چاہوں گا تو جینا بھی پڑے گا مجھکو

ہائے رے سادگی لطف، دمِ آخر بھی
درس دیتے ہیں وہ تسلیم و رضا کا مجھکو

کیوں نہ آتے وہ عیادت کو مری اے ہمدم
آئے اور دے بھی گئے جینے کا طعنہ مجھکو

پلکیں کچھ بھیگ گئیں آج تو اُس کی بھی نیاز
اس نے، کیا جانئے، کس حال میں دیکھا مجھکو

شفقت کاظمی :-

زیرِ لب کہہ گئے جو دیوانے — آہ وہ ناتمام افسانے
اجنبی ہیں دیارِ دوست میں سب — کون ہم بیکسوں کو پہچانے
تیرے وحشی جہاں جہاں پہونچے — تا بہ حدِ نظر تھے ویرانے
قصۂ غم سنا کے دیکھ لیا — اور بھی ہوگئے وہ بیگانے
تعلق اب بھی اُن سے کم نہیں ہے — مگر پہلا سا وہ عالم نہیں ہے
چھڑی ہے جب کبھی روداد اپنی — کسی کی آنکھ بھی نم ہوگئی ہے
مری محرومیاں اللہ اکبر — اب اُن کی یاد بھی کم ہوگئی ہے
جہاں نکلی کوئی بات اُسکے منہ سے — وہی تقدیرِ عالم ہوگئی ہے
خفا رہنے لگا ہے جب سے کوئی — محبت اور محکم ہوگئی ہے

غنی احمد غنی :-

کسی کی اتنی توجہ بھی مجھ پہ کیا کم ہے — ہنسی تو آج انھیں میرے حال پر آئی
طلسمِ جلوۂ جاناں ارے معاذاللہ — نظر گئی جو اُدھر پھر نہ لوٹ کر آئی
مآلِ خندۂ گل پھر گیا نگاہوں میں — ہنسے جو پھول تو شبنم کی آنکھ بھر آئی
عزیز تر ہے مجھے راحتِ دو عالم سے — وہ غم کہ جس سے مری زندگی نکھر آئی
یہ کس خیال میں کھویا ہوا ہے دیوانے — ذرا نظر تو اُٹھا اُن کی رہگذر آئی

پیغام تابانی - کلکتہ :-

چاندنی رات میں وہ کیا نکلے — چاند کی روشنی کو لوٹ لیا
نہ ہو تکمیل جس کی داستاں تیری محبت سے — کہانی بے اثر اُس کی، فسانہ ناتمام اُس کا
بتاؤں کیا کہ میرے دلپہ اُسدم کیا گزرتی ہے — کوئی بھولے سے لے لیتا ہے جب محفل میں نام اُس کا
ہم فقیروں کا کیا ٹھکانہ ہے — تیرا کوچہ سدا رہے آباد
جینے کو جی رہا ہوں ترے انتظار میں — کس طرح کٹ رہی ہے مری زندگی پوچھ
مانا کہ غمِ عشق بڑی چیز ہے لیکن — دل میں ہیں ترے غم کے سوا بھی کئی غم اور

مکتوباتِ نیاز

(تین حصّوں میں)

ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوطِ غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، ان آڈیشنوں میں پہلے آڈیشن کی غلطیوں کو دُور کیا گیا ہے اور ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر طبع ہوئی ہے قیمت ہر حصّہ کی چار روپیہ (علاوہ محصول)

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیانِ طریقت و علمائے کرام کی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ، انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت آٹھ آنے (علاوہ محصول)

۵۵ سال کے بعد

ایک بے مثل نفسیاتی مطالعہ جس میں نہایت تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ۵۵ سال کے بعد مسرور زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے زبان و انداز بیان کے لحاظ سے یہ کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ ناول کا سا لطف دیتی ہے۔ یہ کتاب انگریزی زبان کے ایک شاہکار کا ترجمہ ہے۔ قیمت ۳ر (علاوہ محصول)

مالہ و ماعلیہ

حضرت نیاز نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ فن شاعری کس قدر مشکل فن ہے اور اس میدان میں بڑے بڑے شاعروں نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں اور اس کا ثبوت انھوں نے دورِ حاضر کے بعض اکابر شعرا، مثلاً جوش، سیماب وغیرہ کے کلام کو سامنے رکھ کر پیش کیا ہے، ملک کے نوجوان شاعروں کے لیے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے قیمت دو روپیہ

شہاب کی سرگذشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم المثال افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے، اس کی زبان تخیل، اس کی نزاکت بیان اس کی فضا، عالیہ کے درجہ تک پہونچتی ہے، یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔ قیمت دو روپیہ (علاوہ محصول)

مذاکرات نیاز

یعنی نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس رسالہ کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ جدید ایڈیشن ہے جس میں صحت و نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے، ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر، فارسی زبان کی پیدائش پر مؤرخانہ نظر، اُردو شاعری پر تاریخی تبصرہ، اُردو غزل گوئی پر عہد بہ عہد تبصرہ، نقش ہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد، فنون، اڈیٹر حقیقت نگاری۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

فراست الید

اس کے مطالعہ سے ہر ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات و بیماری شہرت و نیک نامی پر پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ

نگار کے خاص نمبر

سال نامہ ۱۹۲۸ء (مومن نمبر)

(مومن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ مومن کے مطالعہ کے لیے اس کا پڑھنا از حد ضروری ہے۔ قیمت تین روپے (علاوہ محصول)

جنوری ۱۹۴۳ء (ریاض نمبر)

اس نمبر میں ریاض خیر آبادی مرحوم کے کلام پر ملک متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۴۸ء (پاکستان نمبر)

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو مشتہر کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت پانچ روپیہ (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۴۹ء (افسانہ نمبر)

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع کیے گئے ہیں۔ اس سال نامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اصول ہیں اور ہر اصول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہیے۔ قیمت تین روپیہ (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۵۱ء (مشرق وسطیٰ نمبر)

اس سالنامے کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں اڈس ہنڈی کی مشہور عالم کتاب 'ایک مستقبل کی تلاش' کا ترجمہ اقتباس ہے جس میں اس میں ایران، مصر، عراق فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے، اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے۔ اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں، سالنامہ کو دوسرا حصہ ایڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت پانچ روپیہ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۲ء (حسرت نمبر)

جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی، حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ قیمت تین روپیہ (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۵۳ء (داغ نمبر)

(داغ نمبر) جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کیے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے اس نمبر میں قیام رامپور، حیدرآباد کے زمانہ کے علاوہ ان کی حیات عشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے فن شعر گوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ قیمت چھ روپیہ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۴ء (فرماں روایان اسلام)

(فرماں روایان اسلام نمبر) یہ تاریخ اسلامی کا نچوڑ ہے جس میں ولادت نبوی سے لے کر اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے شجرے دے کر ان کے عروج و زوال کو بتایا گیا ہے، یہ سال نامہ دراصل تاریخی کتاب ہے جو ہر پڑھے لکھے کے پاس ہونا چاہیے۔ قیمت چار روپیہ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۵ء (علوم اسلامی نمبر)

(علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر) مع تتمہ جس میں اسلامی علوم و فنون پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مسلم حکومتوں نے علوم و فنون کی ترقی میں کیا حصہ لیا۔ اس کے علاوہ تمام ممالک اسلامیہ کے اکابر علم و ادب کے مختصر حالات دے کر ان کی علمی خدمات اور تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے۔ قیمت چار روپیہ (علاوہ محصول)

سال نامہ ۱۹۵۶ء (خدا نمبر)

خدا کا تصور عہد تاریک سے لے کر عہد حاضر تک۔ بے مثل تاریخی و تحقیقی تبصرہ مذاہب عالم پر۔ قیمت پانچ روپیہ (علاوہ محصول)

سال نامہ ۱۹۵۷ء (اصناف سخن نمبر)

غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، مرثیہ وغیرہ جملہ اصناف سخن پر ایک بیش بہا ذخیرہ معلومات۔ قیمت پانچ روپیہ (علاوہ محصول) صنیہ جوزگار لکھنؤ